

خازاچا



۱۸۸۸۱۵

۹۲۰
ساوے میں

پیرے صحرائے آفریقہ میں اختارہل
"ساوے"

UNIVERSAL
LIBRARY

OU 188810

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۰

Accession No. ۱۵۲۲۶

Author: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

Title: قارئین کے لیے

This book should be returned on or before the date last marked below.

خارِ زارِ حیا

از

ایل - ایم - سائوے

ایڈیٹور
ایڈیشن
عابد روڈ حیدرآباد

دو روپیہ آٹھ آنہ

قیمت

۱۵۲۲۶
جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایل۔ ایم۔ سائوے
دوئل گورڈ جی۔ ر۔ آبادکن

تعداد طبع ایک ہزار

منظوم
انتظامی پریس شکر باغ جید آباد

”نوجوانانِ دکن کے نام“

پیش لفظ

۱

ہاں اہل نرم ہے کوئی نقاد سوز دل

لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کچھ ہوئے

کسی کتاب کا پیش لفظ یا تعارف نامہ لکھنے کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو جاہ و ثروت مرثیے یا ادیب کی حیثیت سے شہور ہو جس کے نام سے کتاب کی قدر و منزلت کو چار چاند لگ جائیں لیکن اس عجیب سوانح حیات کے پیش لفظ لکھنے کے لئے مٹرساؤ نے مجھے انتخاب کیا جو خود بھی اپنے سے واقف نہیں کسی اور کا جاننا اور واقف ہونا درکنار!

تقریباً ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے جب مٹرساؤ نے سے میری ملاقات ہوئی۔ ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی گفتگو سے میں کچھ ایسا متاثر ہوا کہ دوبارہ ملنے کی غلش دل میں لے کر اٹھا۔ دوسری ملاقات میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سلسلہ گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ صحرائے افریقہ کی بھی عرصے تک صحراؤں کی گردی کر چکے ہیں جہاں سیر و شکار کے علاوہ ایک مدت تک جنگ عظیم میں بطور سیاسی قیدی کا گھوسا ہونے کے باعث جیل بھی بھگنی پڑی اور تختہ دار پر لٹکائے جانے کے احکامات بھی حکومت نے دئے۔ لیکن

جنگ ختم ہونے کے باعث اتفاقیہ بچ گئے ہاتھی کے شکاریں جن عجیب غریب
 حادثات سے دوچار ہونا پڑا اس میں کونسا عجیب ہوتا تھا کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ ان
 حیرت انگیز واقعات کو سن کر میں نے عرض کیا کہ یہ تجربات زندگی نو جوانوں
 کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہ کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو۔
 فرمانے لگے کہ مرہٹی کے ایک پرچے میں کئی سال قبل یہ باقسط شایع ہو چکے ہیں
 جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ ترجمہ بہت مختصر سا تھا۔ البتہ اس میں اس امر
 کی گنجائش تھی کہ اگر اسے باقاعدہ مرتب کیا جائے تو ایک ادبی کتاب کا درجہ
 مل سکتا ہے۔ میری سرکاری مصروفیتیں اتنی زیادہ تھیں کہ اس کام کے لئے
 وقت نکالنا دشوار تھا۔ چند ماہ پہلے میری نظر انتخاب مولانا فصیح انصاری پر پڑی۔
 جو ان دنوں دو اخانہ عثمانیہ میں زیر علاج تھے۔ میں عیادت کے لئے دو اخانہ
 گیا۔ ان کی حالت خراب تھی۔ لیکن میں نے اس کا تذکرہ کر ہی دیا۔ اللہ اقدس فرما
 میری بات کبھی نہ ٹالتے تھے۔ استاد ہونے کے باوجود میرے ساتھ دوستوں کا
 سلسلوک کرتے۔ میں نے ترجمہ کے اوراق ان کے حوالے کر دیے اور انھوں نے
 بستر مرگ پر ہی اس سول کو اس رنگ میں رنگ دیا جسے شروع کرنے کے
 بعد جب تک ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اول تو واقعات ہی
 کچھ ایسے حیرت انگیز اور عجیب ہیں اس پر فصیح مرحوم کی رنگینی عبارت !!
 اس کتاب کو ترتیب دے کر کئی ماہ ہوئے لیکن مٹر ساڑھے کی گونا گوں
 مصروفیتوں سے شایع نہ کر سکیں۔ موصوف کی عمر اس وقت ساٹھ سے
 تجاوز ہے۔ بظاہر ایسے تو انا بھی دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن ان کے خیالات

اور جذبات نوجوانوں سے زیادہ پرجوش ہیں۔ انہیں اہل ہند کی غلامی و ذہنیست
دیکھ کر انتہائی تکلیف ہوتی ہے۔ عرصہ قبل ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

مشاق صاحب! اہل یورپ کی کامیابی کا کیا راز ہے؟ ان کی حکومت پر
سورج کیوں غروب نہیں ہوتا؟ وہ متمول بھی ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان
کا کثیر طبقہ نان خشینہ کو محتاج ہے۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا تک میسر نہیں۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ اہل یورپ زمانہ امن میں کامیاب تاجر اور زمانہ جنگ میں
اعلیٰ سپاہی ہوتے ہیں۔ وہاں دو قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مانا کہ ناچر
بننے سے ہمیں کون روکتا ہے۔ مگر افسوس ہمارے نوجوان اس طرف متوجہ
نہیں۔ وہ ہزاروں روپے کی منفعت والی تجارت کے مقابلے میں تیس پے
کی غلامی کو ترجیح دیں گے۔ جہاں غلامی اتنی عزیز ہو۔ اس ملک کی آزادی
کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ جب تک ہماری ذہنیتوں میں غلامی کی بو آتی رہے گی
ہم ہمیشہ غلام رہیں گے۔ پس نے عرض کیا تو آپ ان کی ذہنیتوں کو بدلنے کی
سچی فرمائے۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ بے شمار سائیں آپ کے سامنے ہیں
کہ تباہ آدمیوں نے قوموں اور ملکوں کی حالت میں عظیم تغیر پیدا کر دئے۔
کہنے لگے میں اسی قسم کی فکر میں ہوں۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نوجوانوں
تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں سے غلامانہ خیالات نکال دوں۔ چنانچہ ایک اسکیم
میں نے مرتب کی ہے جس کے ذریعہ نوجوانوں کو غلامی کی قید و بند سے آزاد
کر کے کھلی اور آزاد فضا میں لاکھڑا کروں گا۔

اب کی ذہنیوں کی سچی پیہم کے بندہ اسکیم بقضہ "دی ایسوسی ایٹڈ شو سوں اینڈ بیسٹرنٹ
سین"

کے نام سے مملکت آصفیہ میں لیڈڈ ہو گئی ہے۔ ریاست ایدمت کی حد تک اس کے ذریعہ کالج انڈسٹری میں ایک انقلاب انگیز تغیر حال پیدا ہو جائیگا۔ اس اسکیم کے اصول اساسی کے مطابق صنایعوں اور کارخانہ داروں کے درمیانی واسطے دور کردئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کی شاخیں ہندوستان کے دیگر حصے سے تجارتی شہروں میں بھی قائم ہوئے گی۔ وقت واحد میں کم از کم دو تیس سو نوجوان گریجویٹ کام کر سکیں گے۔ اور تربیت اس نہج سے دی جائے گی کہ تھوڑے عرصے بعد ہی وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ خود اعتمادی کے ساتھ خود مختارانہ کام کر سکیں گے۔

میں نے اس اسکیم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور سمجھا۔ مجھ پر اس کا جو اثر ہو اس سے متاثر ہو کر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس اسکیم کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں میں تجارتی ذوق پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ اسکیم بھی مٹر ساوئے کے انہی حیرت آموز جہالات و رجحانات کا نتیجہ ہے جسے آپ دوران مطالعہ ”فاز راجیات“ محسوس فرمائیں گے۔ ایسے ہی جذبات کی حرارت سے اس عمر میں بھی انکا خون آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ گرمی کا تر باہر رکھتا ہے۔

گرچہ پیریم دے عشق چوں دم ساز آید
باز ہنگام نشاط و طرب و ناز آید

مشاق

فہرست

۳۰	ایک خاص باورچی ؟	۱۳	فہرست (یاد ایام)
۳۲	احمد آباد کو روانگی ۱۹۰۳ء	۱۴	ابتدائی زندگی
۳۳	انسریقہ	۱۴	زندگی کی آٹھویں منزل
۳۴	میں سہ کی زندگی میں لال {	۱۵	گھر کے نئے زمین و آسمان
	گاندھی سے ملاقات	۱۷	بڑودہ میں قیام
۳۶	میرا مشکلہ خیز سفر	۱۷	ماموں صاحب کی بھجوت کا اثر
۳۷	فرانسیسی بندر گاہوں سے گزر	۱۸	امتحان میٹرک میں کامیابی
۳۸	اچھوت کے خلاف مہم	۱۹	زندگی کی پہلی ملازمت
۴۰	رنجبار	۲۰	میرے صندوق پر ایک چوٹی
۴۲	موزن لال گاندھی کیلئے ایشیہ	۲۲	مدرسی کی خدمت
۴۳	میری ملازمت	۲۲	کرنل اور برین میرے شاگرد کی حیثیت سے
۴۵	ایشیہ سے جزیرہ بنگالیا کو	۲۳	درس تدریس کے مشغلے پر ایک نظر
۴۶	کیو کو مگر مچھو جانٹن	۲۴	تجارت کا اصول
۴۸	مگر مچھو کے انڈے اور برہمپری	۲۴	احمد آباد میں پھیری کی دکان
۴۹	دو حادثے	۲۶	دوکان کا پہلا دن
۴۹	خونی لہروں کے منہ سے نکلتا	۲۷	کانگریس سلسلہ (احمد آباد)
۵۰	سانپ سے مقابلہ	۲۸	قدت کی قیاسیوں
۵۲	دریائے نیل کا متح	۲۹	احمد آباد کی دوکان
۵۲	دو قابض فراموش ملاقاتیں	۲۹	شادی کی پیش کش اور میرا انکار

۷۵	کالی بارود	۵۴	پھر اینٹے میں
۷۶	کارڈ اسٹ بارود	۵۵	اسٹے کا غذیر دستخط
۷۷	سلیقہ شکار	۵۶	نیبولے میں
۷۸	شکار کا اجازت نامہ	۵۷	لوہے کی کشتی میں سفیر
۷۹	ہاتھی کے شکار کے لئے۔	۵۸	نیبولے آنے کی خوشی
۸۰	ایک ہفتہ کے لئے دو سر شکار	۵۹	تجارت
۸۱	ہاتھیوں کا تماشہ !	۶۰	رام بھاؤ لکھنڈے کی اچانک مو
۸۲	بھالے سے ہاتھی کا شکار	۶۱	میری خطرناک علالت
۸۳	اور اس کی درزناک سزا	۶۲	رشوت ستانی کے مواقع
۸۴	عدالت کی بواجبی	۶۲	ڈاکٹر اسٹونی کے ہاتھی نے ٹکڑے
۸۵	غلاموں کا مقام		کردئے۔
۸۶	میرا پہلا کامیاب شکار	۶۳	مسندی میں
۸۷	ہاتھی کے حصے بخرے		اسٹیٹ کلکٹری ہاتھی کے
۸۸	ہاتھی دانت کی قیمت	۶۴	شکار ہو گئے۔
۸۹	یورپین شکاری	۶۵	میرا افسر
۹۰	ہندوستان کو روانگی اور		ہلکاری کے پردے میں اسٹنٹ
۹۱	شکار کا اتہام		کلکٹری
۹۲	پونہ کی سیر	۶۶	حکام کارو یہ ماتحتوں کے ساتھ
۹۳	چینڈ آنوں اور چینڈ آہیں		مسٹر انڈرسن کی تشریف آوری
۹۴	مرہٹوں کی پست حالی	۶۷	مسٹر انڈرسن کی سختی
۹۵	ہندوستان سے آفریقہ کو واپسی	۶۸	جیسے کو تینا
۹۶	ترک ملازمت	۶۹	سرنہ کہنے کا جرم اور اس کی سزا
۹۷	مستقل مشغلہ شکار		دبچپ مکالمہ
۹۸	پھر مسندی کو	۷۰	صاحب بہادر بدل گئے
۹۹	ترباب سے علاج	۷۱	ہاتھی کا شکار

۱۳۵	حالات کا جائزہ	۱۰۳	سی لاجل نامی ناکامی کا میانی
۱۳۷	میرا ذاتی کاروبار	۱۰۵	کامیاب شکار
۱۳۸	ساڈے موت کے تختہ پر		نئے اجازت نامہ کا حصول
۱۴۰	میری گرفتاری	۱۰۸	اور خطرناک مناظرے
۱۴۱	میری بیوی کی ہوشیاری	۱۰۹	ہاتھیوں کے ہجوم میں
۱۴۲	اسیران بلا کا تعارف	۱۱۲	کان کے پاستا گوئی
۱۴۴	مجموعہ ہاتھ	۱۱۳	کانگو کو (براہ منڈی) روانگی
۱۴۴	ساڈے واسے جیل میں	۱۱۴	بلجین علاقے میں شکار
۱۴۵	ہمارے پہرہ دار	۱۱۵	خونخوار وحشیوں کے محاصرے میں
۱۴۶	اسیران نو	۱۲۰	ہاتھیوں کے جنگل میں
۱۴۶	ایک قیدی کی جرات	۱۲۱	میرا پہلا شکار
۱۴۷	کچھ اسیران بلا۔	۱۲۲	مجھے مبارک بادی
۱۴۸	ملازموں کا حشر	۱۲۴	میرا فرار
"	ایک خوفناک نظارہ	۱۲۵	پیشل پر حملہ
۱۴۹	سوالات اور سازش	۱۲۷	ایک اور افتاد
۱۵۰	پولیس کی کوشش	"	شکاری خود شکار کے پھندے میں
۱۵۱	کورٹ مارشل کا فیصلہ وہی قابل	۱۲۹	جما کی آب ہتی
	وہی منصف وہی شاہد تھے	"	یہ مصیبت کیوں نازل ہوئی
۱۵۲	تار بنام گورنر	۱۳۰	بمبارہ کو واپسی
۱۵۲	ہماری حالت	"	بمبارہ میں کاروبار
۱۵۴	ہمکو نرے موت	۱۳۱	ہندو نشان کو واپسی
	تختہ دار	"	ہندو دھرم کی تنگ نظری
۱۵۵	پھانسی کی سزا	۱۳۴	افریقہ کو واپسی
۱۵۶	جاسوس کا پتہ	۱۳۴	ساڈے لے سارت کے میدان میں
۱۵۷	میرا دفتر	"	انڈین ایسوسی ایشن

۱۸۱	ہندوستانی فوج کا کارنامہ	۱۵۹	فیصلہ
	شجاعت	۱۶۱	ہمارا حال
	شمالی افریقہ میں جرمن فوجوں کا	۱۶۲	موت ملتوی
	قید میں میرا ایک بچہ	۱۶۳	جیل میں
۱۸۴	کچھ مسلمانوں کا مقدمہ قتل	۱۶۷	رہائی
۱۸۶	پھانسی کا عبرت ناک نظارہ	۱۶۹	جیل کی زندگی
۱۸۸	قید بے قیدی پر ایک طائرانہ	۱۷۰	چند شہیدانِ قلم
	نظر	۱۷۲	ہندوستان کے پروردہ گوروں کے نظام
	ہماری رہائی کے متعلق	"	ہندوستانی سپاہیوں پر
۱۸۹	گفتگو اور اس کے نتائج		ہانا بھاری عقیدے کی رہائی
۱۹۲	ایک بیسٹر صاحب خط نصیحت	۱۷۲	اور اس کے بھائی کی موت
۱۹۴	بھروہی میدان اور وہی	۱۷۴	مسٹر بھیسے کے کروت
	دوڑ	۱۷۵	چاہ کن راہ چاہہ پڑیں
۱۹۵	کانگریس میں نونو شرکت	۱۷۶	فریضہ انسانیت
۱۹۸	کوٹھ عرب ایسوسی ایشن	۱۷۷	حاجی وارڈ بوائے
۱۹۹	سوشل سروس لیگ	۱۷۸	محفل میلادِ نبوی میں بے ادبی کی سزا
۲۰۰	ہندوستان کو واپسی	۱۸۱	راما سندن کا انجام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کہتا ہوں جمع پھر جگرِ نخت نخت " کو
عرضہ ہوا ہے دعوت فرماؤں کے ہو

یا ایام

ابتدائی زندگی

میں کہاں پیدا ہوا، سنتا ہوں کہ علاقہ گوگن میں۔ میں نے چشمِ شعور
کھلنے کے بعد اپنے مقامِ ولادت کو آج تک نہیں دیکھا۔ میری چار برس کی
عمر تھی کہ والد ماجد خدا ان کو غرقِ رحمت کرے، اپنے ہمراہ گوگن سے حجرات
لے آئے۔ نخت و اتفاق نے یوں تو تمام دنیا کی خاک چھینوائی مگر وہاں ایک
بار بھی نہیں پہنچایا جہاں میں پیدا ہوا قسمت بھی کتنی ہیشیلی اور کتنی مندی
ہوتی ہے۔!

ہر انسان کو اپنی جنم بھومی سے دلی لگاؤ ہوتا ہے۔ مجھے بھی
کوئٹہ سے اس علاقے کی بنا پر مصنوعی تعلق ہے۔ آج بھی اس پاکیزہ سرزمین
کے لئے میرے دل کی تہنائیوں میں بخانے شوق و اضطراب کے کتنے پرجوش
ہنگامے بپا ہیں۔ اور اس کی یاد سبیری آنکھوں میں کتنے حسرت اور پاس کے
آنسوؤں کے کتنے خاموش طوفان اٹھ رہے ہیں اسے میرے سوا کون جا
سکتا ہے۔

زندگی کی آٹھویں منزل میں نے روز پیدائش سے آٹھ سال تک
ایک ایسے شہر میں، رسیلی، اور لطیف
زندگی بسر کی جسے میری تمام عمر کا حامل سمجھنا چاہئے۔ والد ماجد کی محبت بہری
نگاہ اور والدہ مکرمہ کی پر از شفقت آغوش یعنی کائنات کی بیش بہا تر
دولتوں سے میرا دامن وجود بھر پور تھا، میرے وہ ماں باپ جو میرے
لئے سعادت و محبت کے سرچشمے تھے۔ ان پر اس دکھ بہری دنیا میں خواہ
کتنی ہی قیامتیں کیوں نہ ٹوٹی ہوں کتنی آنفتیں نہ منڈلائی ہوں مگر مجھے کچھ
نہیں معلوم۔ میں تو اس بہشت ارضی میں تھا جسے ماں کی چاہنت اور باپ
کی ناز کشی نے میرے لئے سجایا تھا۔ میرے لئے یہ ایک ایسا جہنم تھا جس میں
غم کے بادِ سموم کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی کبھی نہیں آیا۔

مگر افسوس یہ بہشت بہشت کا ایک خواب ہی نکلی اور اس کی
سرتیں سرتوں کا کم عمر فریب۔ آٹھویں سال جو آنکھ کھلی تو پھر میں بالکل
ہتی مایہ، اور محروم تھا نہ میرے سر پر باپ کا سایہ رحمت، اور نہ میری جانب

۱۵
 ماں کی شفقتوں کی رنگینوں میں ڈوبی ہوئی نظراب میں بائبل ہی مجلس تھا
 میری ساری دولت چھن چکی تھی منجے کا سارا دہن دولت اُس کے ماں
 باپ ہیں جب وہی نہ رہے تو پھر اُس کے پاس کیا رہ جاتا ہے دنیا
 اُس کے لئے ایک گہوارہ ابتلا بن کر رہ جاتی ہے اور ساری وسیع کائنات
 اُس کے لئے ایک تنگ زندان محبت ہو جاتی ہے جس کی ہر ساعت فتنہ
 ریز۔ اور ہر آن قیامت بدوش! معاذ اللہ!!

پندرہ یوم کی مختصر سی مدت میں مجھ پر کیے بعد دیے گئے مصیبت
 کے دو پہاڑ پھٹ پڑے پہلے والدہ کرمہ مجھے اپنی محبت و شفقت
 سے ہمیشہ کے لئے محروم کر کے اس دنیا سے عالم جاودانی کو تشریف
 لے گئیں اُس کے بعد اسی عشرہ میں جناب والد ماجد بھی اس جہاں خاک
 سے سد ہار کر حنبت کے عازم ہو گئے۔

الغرض قدرت نے زندگی کی پہلی ساعت میں مجھے جو کچھ دیا
 تھا وہ زندگی کے آٹھویں سال مجھے چھین لیا۔

اے با آرزو کہ خاک شدہ!!

گھر کے نئے زمین و آسمان
 والدین کے انتقال کے بعد میری
 دنیا ہی بدل گئی تھی گھر اور گھر

کی زمین اور چھت تک بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر چیز پر
 ادا کی، مایوسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ گھر کی
 ساری کائنات پر اچانک کتنے سا طاری ہو گیا ہے، درے درے کو

کا بوس کی بیماری نے جکڑ لیا ہے۔

گھر میں لے دیکھے میرے دو بھائی تھے جن میں سے ایک مس روپیہ
 سے ماہوار کے پٹواری ہو گئے تھے اور دوسرے بھائی بھی اسی طرح کی
 ایک معمولی خدمت پر دقت گزارا کرنے پر مجبور تھے۔ میرے دونوں
 بھائیوں نے میرے ساتھ انتہائی بہادرانہ محنت اور خلوص اخوت سے
 تعلقات قائم رکھے، میں حصول تعلیم میں مصروف ہو گیا اور کچھ دنوں کے
 بعد امر ٹی (کاٹھیا واڑ) کے ایک اسکول سے جماعت ششم میں کامیابی
 حاصل کی۔ حالات ناگفتہ بہ تھے۔ معاش اور مصارف تعلیم کے حصول کے
 لئے دشواریوں کا سامنا تھا۔ میں نے اسی مختصر سی تعلیم کو سر دست کافی
 منظور کیا۔ اور یہ خیال ہوا کہ جس طرح اور میرے بھائی ملازمت کر
 رہے ہیں۔ میں بھی اس قسم کی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت حاصل کرنے یا
 کامیاب ہو جاؤں گا۔ کم از کم تلافی یا اپکار سی کی کوئی خدمت مل
 ہی جائے گی۔ آدمی ماحول سے بھی کس قدر متاثر ہوتا ہے میں نے انھیں
 کھول کر جو کچھ اپنے گھر میں دیکھا۔ اُس کا کتنا گہرا اثر میرے خیالات
 پر پڑا۔ اب گویا ایک ملازمت اور وہ بھی معمولی ملازمت ہو گیا میرے
 لئے معراج الکمال کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اور گویا ملازمت جیسا ایک ہنڈیہ
 غلامی کہنا چاہئے۔ میری زندگی کا مضرب العین ہو گئی تھی۔

قدرت کی ہر بانیاں مجھے ہونے کے باوجود کتنی مؤثر ہوتی ہیں۔
 میں نے مذکورہ بالا خیال بکرا غلط اندیشی کے تحت جب حصول ملازمت کا

غزم کیا تو میری عمر کی کہیں سے اٹنے ہوئی کیونکہ اس وقت میں صرف ۱۱ سال کا تھا اور اس عمر میں کوئی سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

بڑودہ میں قیام کے آخر سب کے شورے سے میں اپنے ماموں صاحب کے پاس رہا۔ بڑودہ گیا اور وہاں انگریزی تعلیم شروع کر دی ماموں صاحب کی ایک دوکان تھی جس میں چائے چینی اور دیگر معمولی مٹھائیاں اور نلکیں اشیاءِ فروخت کی جاتی تھیں۔ میں جب پڑھنے سے فرصت پاتا تو ماموں صاحب کی مرضی پائیائے سے نہیں بلکہ خود اپنی خوشی سے ان کی دکانیں کام کرتا۔ خریداروں کو سود دیتا۔ چائے کی پیالیاں اور دوسرے برتن دھوتا اور جو کام ہوتے ان کو انجام دیتا۔ اس سے میرا اپنا مقصد یہ تھا کہ میں سنت کا عادی ہو جاؤں اور نہ ماموں صاحب مجھے منع فرمایا کرتے اور چینی کی تاکید فرماتے لیکن مجھ کھیلنے یا فضول مشاغل میں اوقات ضائع کرنے سے یہی بہتر معلوم ہوتا تھا کہ میں کام کرنے کی عادت ڈالوں اور ماموں صاحب کا کچھ ہاتھ بھی بٹاؤں۔

میں ابھی بیان کر چکا ہوں ماموں صاحب کی صحبت کا اثر کہ آدمی ماحول سے متاثر ہوتا ہے گھر پر جس ماحول سے میں متاثر ہو کر قبل از وقت ملازمت کا خواہشمند ہو گیا تھا چونکہ اب وہ ماحول نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ خیالات بھی نہیں رہے تھے۔ جدید ماحول نے جدید خیالات کی پیدائش اور

پرورش کی۔ ماموں صاحب نہایت آزاد خیال، بلند نظر اور پاکیزہ فطرت
 واقع ہوئے تھے۔ وہ عموماً ملازمت اور خصوصاً سرکاری ملازمت کو بہت
 ہی برقی نظر سے دیکھتے اور اسے انسانیت کی توہین خیال کرتے تھے۔ اس
 کے نتیجے میں وہ سرکاری ملازمین سے بے نفرت کر گئے تھے۔ وہ برٹش
 سرکاری ملازم کو اس کی تنخواہ اور عہدے کی مناسبت سے ذلیل اور
 کم تر تصور کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرکاری ملازمت انسان سے
 ہر پاکیزہ صفت اور ہر بلند اخلاقی چھین لیا کرتی ہے۔ میں وقتاً فوقتاً
 ان کے ارشادات سنتا اور غور کرتا تو مجھے یہ محسوس ہوتا کہ مجھے میرے
 دل اور دماغ میں روشنی بہ رہی اور تاریکی نکلتی جا رہی ہے۔ ماموں صاحب
 نے نیشنلسٹ سبب سے پورے خیالات میں نہایت مبارک اور سچسٹ انقلاب
 پیدا کر دیا۔ اور ایسے نقوش مرتسم کر دیئے جو سالہا سال لگنے کے بعد
 آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

میں ماموں صاحب کے پاس دو
امتحان میٹرک میں کامیابی سال رہا اس کے بعد حالات کچھ اچھے
 ہو گئے کہ بھائیوں کے پاس سے چار چار پانچ روپیہ ماہوار لے لے لے۔
 اب میں نے مناسب سمجھا کہ ماموں صاحب کے پاس سے ہٹ کر الگ
 زندگی گزارنے کا سلیقہ پیدا کروں چنانچہ میں ان کے پاس سے الگ
 ہو گیا۔ اب میری معاش کے لئے بھائیوں کی بھیجی ہوئی امداد کے سوا
 دو تین روپیہ ماہوار کا ایک ٹیوشن کر لیا اور دو تین روپیہ برگ انوس

کی بیئر بلایا ہنا کر مدر سے کے لڑکوں کے ہاتھ فروخت کرنے سے حاصل ہو جائے
اس طرح میں گزرا وقت کرنے لگا۔ امرتلی چھوڑنے کے ۵۰ سال کے بعد
میں نے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

زندگی کی پہلی ملازمت میں نے چاہا کہ کالج کی تعلیم شروع
کروں لیکن مرض بوابیسر کی شکایت نے اس درجہ صحت خراب کر دی تھی
کہ شوقِ تعلیم کا گلا گھونٹنا پڑا، اور حصولِ علم کا مبارک مشغلہ ترک
کر دیا پڑا۔

بیماری کا یہ تقاضہ ہوا کہ میں بغرض تبدیل آب و ہوا کسی جگہ جاؤں
اس کے لئے امرتلی مناسب سمجھا گیا۔ میں امرتلی آیا مگر بیماری بھی نہ ایک
مستقل روگ ہے کچھ دنوں بعد ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا سخت محال
معلوم ہونے لگا۔ کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کسی آزاد پیشہ اختیار کرنے
کے لئے کچھ نہ کچھ سرمایہ ہونا چاہئے اور میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ گو ماموں
صاحب کی صحبت نے مجھے ملازمت سے متنفر کر دیا تھا تاہم سردست
کچھ نہ کر سکنے کی صورت میں بھی مصلحت سمجھی گئی کہ میں عارضی طور پر ہی
سہی کوئی ملازمت کر لوں۔ بہر حال بالکل خالی وقت گزارنے سے
کچھ نہ کچھ کرنا بہتر ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے ملازمت کی جستجو
کی اور امرتلی کی عدالت سیشن میں بارہ روپیہ ماہوار کی ایک خدمت
بلا وقت لگئی۔ میں نے کہا چلو غنیمت ہے وقت بھی کے لگا اور کچھ پیسے

بھی حکومت کے خزانے سے وصول ہو جائیے۔

غلام یہ بارہ روپیہ بحساب سکے شاہی تھے جس کے لیے کلدار (انگریزی) ہوتے ہیں گویا میں کس روپیہ سات آنے ہی ماہوار کا ملازم تھا۔ میرے پسر و دیوانی کے مقدمات کی پیشیاں مقرر کرنا تھا اس دفتر میں انگریزی تعلیم یافتہ اہلکاروں میں میرے سوا ایک اور اہلکار شکر راؤ نامی تھے۔ ان کی مدت ملازمت دس سال کی ہو چکی تھی اتنی طویل مدت گزرنے پر اب ان کی تنخواہ سٹلہ سکے با شاہی تھی یعنی بحساب سکے انگریزی (کلدار) اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ $\frac{14}{100}$ پانے کے لئے مجھے کم از کم دس سال چاہیں۔

ابھی مجھے زمرہ ملازمت **میزے صندوق پر ایک چونی** - ۶ میں داخل ہوئے چار ہی روز گزرے تھے کہ ایک شخص نے اگر ایک چونی میرے صندوق پر رکھ دی۔ اور یہ کہا کہ یہ نذرانہ ہے آپ براہ کرم میرا مقدمہ جس کی پیشی فلان تالیخ کو مقرر ہے اسے تبدیل فرما کر فلان تاریخ پر کر دیجئے۔ یہ پہلی رشوت کی قسم تھی۔ جو میرے سامنے آئی۔ اور یہی آخری رقم بھی تھی کیونکہ اس کے بعد میں نے کبھی کسی صاحب معاملت کو اتنا جری نہیں ہونے دیا کہ وہ اس قسم کی ناجائز رقم میرے سامنے پیش کرتا۔ جس نے اس کی فرمائش کی تکمیل کر دی اور سختی سے کہا کہ اپنی یہ چونی اٹھا لو اور آئندہ سے ایسی حرکت نہ کرنا

اس چونی نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے خیالات کا دنیا میں کشمکش پیدا کر دی۔ میں نے سوچا کہ تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ وہ کسی طرح بھی ضروریات حیات کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ قلیل مشاہرے والے اہلکار اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر یقیناً ایسے ناجائز نذرانے (رشوت کی رقمیں) قبول کرتے ہونگے اور یہ دیانت کے خلاف ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کل کی حکومتوں کی ملازمت کر کے کوئی شخص دیانت داری سے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بالفاظ واضح ہر حکومتیں اپنے اہلکاروں کو خود مجبور کرتی ہیں کہ وہ رشوتیں لیں۔ اگرچہ بظاہر رشوت دی اور رشوت ستانی دونوں جرم ہیں مگر اس سے بڑھ کر بوجہ اور کیا ہوگی کہ حکومت خود ہی قانون بناتی ہے اور خود ہی ایسی حکمت عملی اختیار کرتی ہے کہ خوب رشوتیں لی جائیں اور دی جائیں اس ایک معمولی سے واقعہ نے میرے دل میں ملازمت کی جانب سے جو جذبات نفرت تھے اس میں قوت پیدا کر دی مجھے خیال ہوا کہ میری تنخواہ اور اکثر اہلکاروں کی طرح اتنی قلیل ہے کہ اس میں کسی طرح گزار ممکن نہیں۔ دوسرے اہلکار اس کمی کو کسی نہ کسی قدر رشوتوں سے پورا کر لیتے ہیں کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں بھی یہ طرز عمل اختیار کروں۔ میرے ضمیر نے اس ناپاک خیال کو بری طرح ٹھکرا دیا۔ کہ ایسی سزاؤں سے فاقہ کشی کر کے مر جانا لا کہہ درجہ بہتر ہے۔

میں نے غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ حصول رزق کے وسائل میں سب سے برا وسیلہ ملازمت ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان جفاکشی

کر سے، محنت مزدوری کرے اور پیٹ کی آگ کو بجھائے۔

میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں ملازمت ترک کر دوں گا۔ میرے بس کا یہ روگ نہیں۔ لیکن میرے احباب و مخلصین نے میرے اس خیال کی شدید مخالفت کی کہ ایک ملی ہوئی مستقل ملازمت اور قابل وظیفہ کو ترک کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

مدرسی کی خدمت میں نے کسی نہ کسی طرح چار پانچ ماہ یہ بار ملازمت اٹھایا۔ اتفاق سے وہاں کے ہائی اسکول میں مدرسہ کی ایک ہنگامی خدمت چھ ماہ کے لئے بشاہرہ علیہ روپیہ مل گئی۔ میں نے اس عدالتی ملازمت کے مقابلے میں اس کو غنیمت سمجھا۔ اور فوراً استغفا دیکر بچوں کی خدمتگاری شروع کر دی۔ گو یہ ملازمت مستقل نہ تھی۔ صرف چھ ماہ کی قلیل مدت کے لئے تھی۔ لیکن ضمیر و ذوق کا جب قدر خون عدالت کی ملازمتوں میں ایک شریف انسان کو کرنا پڑتا ہے تعلیمات کی ملازمت میں نہیں۔ اس لئے میں نے ایک وقتی ملازمت کو مستقل ملازمت پر ترجیح دی گو بعض احباب نے میرے اس فعل کی کافی مذمت کی لیکن میں نے کوئی پروا نہ کی۔

گرینل او برین میرے شاگرد کی حیثیت سے اس مدرسہ کی ملازمت بھی مل گئے۔ جن میں ایک تو کوٹھاپور ایسٹ کے ٹرینرز رزٹنڈنٹ گرینل او برین تھے جو مجھ سے مرہٹی زبان اور مرہٹی ادبیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور

دوسرا ٹیوشن بھی ایک اچھے خاندان کے طالب علم کا تھا۔ اب ٹیوشن اور اسکول کی تنخواہ ملا کر میری ماہانہ یافت ضلع (پچاس روپیہ) ہو گئی تھی۔

مدرسہ کا پیشہ اس لحاظ سے درس تدریس کے مشغلے پر ایک نظر نہایت بہتر ہے کہ اُس سے دوسرے لوگ علمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے اس مشغلے کی اہمیت ظاہر ہے۔ مگر اس لحاظ سے کہ ایک مدرس عام حالات میں خود اپنے لئے کچھ زیادہ سود مند نہیں ثابت ہوتا کچھ زیادہ مفید مشغلہ نہیں۔ کیونکہ وہ کثرت کار اور شدت مصروفیت کی بنا پر اس کا موقعہ نہیں پاتا کہ خود اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ اسکول کی حاضری، گھر پر طلبہ کی کامیوں کے اہتمام کی دیکھ بھال، ڈائری کی تحریر، اسباق کی تیاری اتنے کام انجام دینے کے بعد مدرس کو کہاں اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ مطالعہ میں مصروف ہو کر اپنے علم کی سطح کو اونچا کرے۔ بس ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس میں تمام زندگی وہ چکر لگاتا رہتا ہے اور اس کے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، ایسے لوگ بہت ہی شاذ ہیں جو مدرس کا پیشہ کرتے ہوئے اور اس کے تمام آداب و فرائض کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی ذاتی علمی ترقی کر سکیں، ایک مدرس جس روز ملازمت میرا داخل ہوتا ہے۔ اور جس روز وہ وظیفہ لیکر اس خدمت سے سبکدوش ہوتا ہے اس کی علمی سطح ان دنوں میں تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔

شہرہ آفاق گھوٹے اور پراچھے جیسی ہستیاں از قبیل مستثنیات ہیں
میرا مقصد مدرس کی ملازمت اختیار کرنے سے یہ تھا کہ میں کفایت
شعاری سے کچھ روز زندگی گزاروں جس قدر رقم پس انداز کر سکوں کر لوں پھر
اُس چھوٹی سی پونجی سے کوئی چھوٹی سی تجارت کر دوں۔ جو باوجود محنت طلب
ہونے کے حصولِ رزق کا میرے نزدیک سب سے بہتر اور ذی عزت ذریعہ
ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس ملازمت میں میں نے جہاں تک ہو سکا
کفایت شعاری کے ساتھ محتاط زندگی بسر کی اور ٹھوڑی سی رقم
جمع کر لی۔

اس میں کلام نہیں کہ کاروبار کے لئے کافی رقم
تجارت کا اصول کی ضرورت ہے مگر یہ خیال کرنا کہ کام شروع
کرنے کے لئے۔ کافی رقم کا ہونا ضروری ہے۔ صحیح نہیں اگر کام کرنے
والا محنتی جفاکش مستقل مزاج۔ دیانت دار کفایت شعار ہے تو کھوڑ
سی رقم سے بھی کام کو شروع کر کے کچھ دنوں میں اپنی حالت سمجھا
سکتا ہے۔ رقم کی کمی، محنت، استقلال، اور دیانت، اسے پوری
ہو سکتی ہے۔ میرے سامنے بس یہی حقیقت تھی۔

میں احمد آباد اس وقت
احمد آباد میں پھیری اور دکان تک زندگی میں صرف ایک
بار میٹرک کا امتحان دینے گیا تھا، وہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا، اس
لئے میں نے اپنی محنت، وجفاکشی کے لئے اُس کو منتخب کیا کہ وہاں کوئی

انگلت نمانی کرنے والا نہیں۔ اس خیال کے تحت میں احمد آباد گیا۔ میری جیب میں چھ روپیہ تھے۔ میں نے چینیہ اور وال سیو وغیرہ کا ایک خانچہ مرحب کیا۔ اور گلیوں گلیوں پھیری لگانے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے ہی روز مجھے منافہ ہوا۔ اس طرح مجھے پورا مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک چھوٹی سی دکان پانچ روپیہ ماہوار پر لی۔ معمولی دو دو عیا کی بیخ، میز اور کرسیاں بنوا کر رکھیں، اور ستے قسم کا چلے کا سامان، کیتلی، پیالیاں وغیرہ بھی خرید کر سلیفہ سے جمادیں۔ چائے کے سوانمکیں چینیہ بچھے۔ لڈو سری کھنڈ، وغیرہ اشیاء خورد و نوش کے بیچنے کا انتظام کیا۔

یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے اس زمانے میں شہر احمد آباد کے اندر اس صفائی اور سلیفہ کی پہلی دکان تھی جس میں گاہکوں کو بیٹھ کر آرام و راحت سے کھانے کے لئے میز کرسی کا انتظام کیا گیا ہو۔ اور دوکانوں پر گاہکوں کے بیٹھنے تک کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ لوگ زمین پر غلیظ مقام پر بیٹھ کر رُبی اور سری کھنڈ وغیرہ کھاتے تھے۔ جس سے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ یہ دکانیں تنگ و تاریک، غلیظ اور بے سلیفہ تھیں، لوگ ضرورت سے مجبور ہو کر ان دکانوں پر جاتے تھے۔ میں نے کچھ شرم خود دیکھا کہ دکانوں میں غلاظت کی شدت سے چار جانب بدبو پھیلی ہوئی۔ غلیظ اور گھونے تختوں پر بیٹھے ہوئے گاہک منہ بنا بنا کر کھا رہے ہیں قریب ہی چھوٹے چھوٹے میٹھے کچیلے چراغ جل رہے ہیں جس کے

۲۶
 دہویں سے دکان کی کوٹھری بہری ہوئی ہے اور گاہکوں کی آہنگوں
 میں یہ دھواں لگ لگ کر اشک باری پر مجبور کر رہا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ
 درحقیقت اس کا باعث ہوا کہ میں یہی کام باقا عدگی۔ سلیفے اور تہنید
 سے کروں مجھے اس کی گنجائش یہاں نظر آئی۔

دوکان کا پہلا دن ؟ میں نے اس دکان پر پورے ساٹھ روپے
 صرف کئے اور اب میرے پاس ایک پائی
 بھی نہیں رہی۔ میرے پاس کوئی نوکر تو تھا نہیں دکان آراستہ کر کے
 میں تہنا بیٹھا شریک کی جانب ٹکٹکی لگائے ہوئے گاگوں کی راہ دیکھنے
 لگا۔ تمام دن گزر کر شام ہونے کو آئی مگر ایک بھی گاہک نہیں آیا۔
 اب میری پریشانی برابر بڑھنے لگی۔ طرح طرح کے خیالات آکر ستانے لگے
 کہ یہ تمام سامان خراب ہو جائے گا پاس ایک پیسہ بھی نہیں کل کے لئے
 دوکان میں سامان کس طرح ہیسا ہو سکیگا۔ اگر آج کچھ فروخت ہو جاتا تو
 انیس پیسوں سے کل کا سامان کیا جاتا۔ مگر تمام دن اور اتنی رات گزرنے
 کے باوجود کچھ بکری نہیں ہوئی۔ اس الجھن میں تھا کہ یکا یک آٹھ دس
 آدمیوں کی ایک جماعت اس نئے سلیفے کی نئی دکان دیکھنے کے لئے اندر
 آئی آئی لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور چائے چینیہ تقریباً ڈیڑھ
 روپیہ کا خریدا۔ اب مجھے کچھ اطمینان ہوا کیونکہ اتنے پیسے آگے نکلے کہ
 کل دکان لگائی جا سکتی تھی۔

پھر اس کے بعد یہ نکر کبھی نہیں کرنی پڑی۔ یوں انیو ما دکان ترقی

کرنے تھی۔ اور کانگرسوں کی آمد میں اضافہ ہونے لگا۔

اس سال احمد آباد میں عظیم الشان کانگریس ۱۹۰۲ء کا اجلاس

پہلے پرانڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس سر پندرنا ٹھنڈی کی صدارت میں ہوا۔ ہندوستان کے چوٹی کے رہبران قوم اور مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے بکثرت شرکت کی۔ مصنوعات ملکی کا افتتاح بھی سر میت سیاجی راؤ ٹھنڈیوار کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔ مشہور و ممتاز لیڈروں میں فیروز شاہ مہتا۔ سیندر سنہا۔ رلاڈو سنہا، چٹا منی، سوپریم مینا آئیئر چند اور کرکی پر جوش تقریریں ہوئیں۔ میں نے ان تقریروں کو سنا۔ ملک کی اجنبی و انفرادی آزادی کا جو خیال میرے دل میں پہلے سے روشن تھا اس کی روشنی میں ان حضرات کے لکچروں نے اور زیادہ اضافہ کیا۔ جناب تنک جی ہاراج بھی تشریف لائے۔ تھے۔ مگر انہوں نے کوئی تقریر نہیں کی۔

مجھے اس موقع پر کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں کے باہر سے آئے ہوئے ہمالوں کے لئے چلے، کافی دودھ وغیرہ کا گتہ (ٹھیکہ) دے دیا تھا۔

میں نے اس کانگریس میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ رہنمائی قوم و ملک کی تقریریں کی اور ان تقریروں کے اثر سے میرا دل پر جوش و رومانغ منور ہوا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری رگ رگ میں قوت،

جرات اور دھن کے لئے قربانی کرنے کی روح رواں کر دی گئی ہے مجھے اس وقت اس کا علم نہیں تھا کہ مجھ پر یہی ایک ایسا دور گزرنے والا ہے۔ جب مجھے بھی ان لوگوں کی طرح تقریر و خطابت حتیٰ کہ جیل اور تختہ دار سے سابقہ کرنا پڑیگا۔ کس کو معلوم کہ اسے زندگی میں کیا بننا ہے اور اس سے آئندہ چلکر قدرت کیا کیا کام لینے والی ہے ایشیائی کلائو۔ اور ایسی ہی دنیا کی دوسری نامور بہنیوں کے ماں باپ نہیں جانتے تھے کہ ان کے یہ فرزند بعد کو کیا کچھ ہونے والے ہیں؟

قدرت کی فیاضیاں عام ہیں، اس قدرت کی فیاضیاں؟ نے تمام قسم کے ملکات انسان کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں۔ ہر قسم کی قوتیں انسان کی فطرت میں موجود ہیں جن کا اندازہ کرنا ہر وقت اور ہر شخص کے لئے ممکن نہیں جس خوش قسمت نے اپنی مخفی طاقتوں کا اندازہ لگا کر ان سے کام لینا شروع کیا وہ شخص اپنے دور کا ممتاز فرد ثابت ہوا۔

ہمارے ملک کے نوجوانوں کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے کو پہچانیں اپنی مستود قوتوں کا جائزہ لیں اور جو کمالات ان کے پردہ وجود میں روپوش ہیں ان کو بے نقاب کریں۔

ملک کے مشہور فیلسوف شاعر علامہ اقبال کا مطالعہ ہر قوم کے نوجوانوں کے لئے بھی مفید ہے۔ اس لئے میں ہندوستان کے جوان فکر و نظر اصحاب کو اس کے مطالعہ کی جانب متوجہ کرتا ہوں۔

یہ دوکان ایک ماہ کے اندر ہی اپنے
احمد آباد کی دوکان پاؤں پر کھڑی ہو گئی خریداروں کا تہمت

افزا ہجوم رہنے لگا۔ اب تک میں تنہا کام کر رہا تھا۔ باورچی، چکے
پز، برتن ماہیخانے والا۔ جہاڑو دینے والا۔ لکاکوں کو سودا دینے والا،
بولے، سیٹھ غرض سب کچھ میں تھا۔ خریداروں کی کثرت سے دکان
میں جگہ کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اس لئے ایک موزوں جگہ پر زیادہ کرائے
کی بڑی دکان لی گئی۔ میرے ایک بھائی پونیس میں بارہ روپیہ
ماہوار کے ملازم تھے۔ میں نے ان کو ترک ملازمت پر مجبور کر کے آزاد
پیشہ تجارت کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس دوکان کا پورا پارچہ ان
کو دے دیا۔ ان سے مجھ کو بچہ مدد ملی۔ اب میرے پورے خاندان کے مسائل
کا مناسب اور موزوں حل اسی دکان سے ہونے لگا۔

ہندوستان میں شادی کی اہمیت
شادی کی پیشکش اور میرا نکاح سے وہ ظاہر ہے جب میرے اعزاء
واجباب نے مجھے معاش کی جانب سے کسی قدر مطمئن پایا تو مجھے شادی
کرنے پر مجبور کیا۔ اس کا مقصد تو میری مسرت اور خوشی دیکھنی تھی میرے
گھر کو آباد دیکھنا تھا لیکن درحقیقت یہی تقریب میری امکانی ترقی،
کی راہ میں ایک دیوار بن جاتی۔ اور آئندہ سے متعلق تمام پروگرام ناکام
بن کر رہ جاتا۔ شادی ہونے کے بعد اس کی پابندیاں اس کے جھیلے ایسے
ہوتے ہیں کہ مرد اس میں پھنکر ایک عجیب و غریب مخلوق بن جاتا ہے۔

میں اُس وقت کی شادی کو بے وقت سمجھتا تھا۔ لہذا میں نے صاف انکار کر دیا۔ اور جس لڑکی کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کوشش کے اُس سے اپنے بھائی کا عقد کر دیا۔

اس زلزلے میں بلخا ضرورت میں نے دکان کے ایک خاص باورچی لے لیا۔ باورچی نوکر رکھا۔ یہ باورچی خاص تھا۔ ایسا خاص کہ یہ میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا سبب بنا۔ اور اس کی باتوں نے میرے عزم و مقصد کی دنیا میں شدید تغیرات پیدا کئے اس کی تفصیل یہ ہے۔

یہ باورچی ایک زمانہ تک مشرقی افریقہ میں رہ چکا تھا۔ جب وہ پورٹو کے لئے آٹا یا میدہ گوندھنے کے لئے بیٹھتا یا کوئی ہانڈی پکاتا ہوتا تو مزے سے لے کر اپنے قیام افریقہ کے زمانے کے دلچسپ واقعات سنایا کرتا۔ اسی سلسلے میں اُس نے بتایا کہ وہاں دولت کمانے کے کتنے وسیع راستے ہیں یا وہاں تجارت کے لئے کتنی راہیں یاد ہیں؟ وہاں حصول زر کے کیسے کیسے امکانات ہیں۔ اُس نے بتایا کہ یوگانڈا ریلوے لائنیں کی تیر کے سلسلے میں بعض لوگ کس طرح ایک بارگی لکھتی بن گئے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ کتنی آسانی سے اچھی اچھی ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ افریقہ کے صحرائی باشندے کس طرح کی گوسفٹ کہاتے ہیں۔ اور وہ ننگے مادرِ ناز کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

وہاں شکار سے کس طرح دولت پیدا کرتے ہیں۔ غرض یہ اور اسی قسم کے نیکڑوں امیڈانز اور حوصلہ پرور حالات سنایا کرتا تھا۔ باتیں سن سن کر میرے

احمد آباو سے افریقہ کو روانگی

ماہ ۱۹۰۳ء

میری دکان پر ایک بگڑاتی جو تقریباً میرے ہم عمر تھے اکثر آکر بیٹھا کرتے ان کا نام سری جیت کمایشنکر دیسائی تھا۔ یہ بھی اس باورچی کی زبانی افریقہ کے حالات سنا کر لئے تھے اور بالآخر ان کو بھی میری طرح افریقہ جانے کی دھن سمائی۔ ہم دونوں نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ دونوں یہاں سے ساتھ ہی روانہ ہوں گے اور وہاں جا کر دونوں ملکر کوئی کاروبار کریں گے۔ دیسائی صاحب موصوف کو تجارتی کاروبار کا شوق تھا اسی شوق کے تحت انہوں نے غیر مالک کے جو پارپوں سے بہت کچھ خط و کتابت کرنی شروع کر دی تھی۔ اس لمبے سفر کی تیاریوں میں تقریباً دو ماہ صرف ہو گئے۔ بالآخر میں نے اپنی دکان اپنے بھائی کے کلیتہ حوالہ کر دی۔ کہ آپ جاؤ اور آپ کا

کام جانے۔

مختصر یہ کہ میں اور سرری جت کسلاشنکر دیبائی۔ مارچ ۱۹۰۳ء
کو احمدآباد سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے۔ اور افریقہ جانے والے جہاز پر سوار
بارہ روز کی سمندری مسافت طے کر کے ہم لوگ بندرگاہ بمباسہ پر
اترے۔

یہاں ہندوستانی تاجروں کی کافی آبادی ہے یہاں کے یو پارٹی
زیادہ تر بھٹے۔ بوہرے، اور خوبے ہی نظر آئے۔ جن کے کاروبار اعلیٰ
پیمانہ پر ہیں۔ اور جو ہر طرح خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ بیبا سو اترنے
کے چند روز بعد یہ حقیقت ہم لوگوں پر منکشف ہو گئی کہ میرے باورچی نے جو
آسانی سے دولت حاصل کرنے کے رنگیں اور دلکش خواب دکھائے تھے
ان کی تعبیر عکس ہے۔ یہاں بھی تحصیل دولت کے لئے ہندوستان
ہی کی طرح غیر معمولی محنت، جانفشانی، اور جدوجہد کی ضرورت ہے تاہم
ہم لوگوں نے اپنی ہمت کو پت نہیں ہونے دیا۔ اور اس امر کا عزم مصمم
کر لیا کہ جب ترک وطن کر کے اتنی دور آئے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور کرینگے
اور کوئی وجہ نہیں کہ ہماری کوشش کا ثمرہ ہو کو نہ۔

افریقہ

بمبئی سے افریقہ روانہ ہونے سے قبل سرری جت کسلاشنکر دیبائی
کے تعارف سے پانچ ہزار روپیہ کے مال حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا جس

طرح میں تجارت کے اصول و آداب سے بالکل بے خبر تھا اسی طرح دیبائی صاحب بھی کاروباری علم و تجربہ سے ناواقف تھے۔ دیبائی صاحب ناگر فرقہ کے برہمن تھے اور ان کے آبا و اجداد میں سے کسی نے بھی تجارت نہیں کی تھی۔

غرض ہم دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ حقیقت بارہا میرے مشاہدے میں آچکی ہے کہ جو لوگ تجارت کے آئیں و اصول سے واقف نہیں ہوتے ان کو ایک بارگی کثیر رقم دے دیجائے تو اکثر وہ رقم بجائے منفعت بخش ثابت ہونے کے ساتھ تجربہ کاری کی نذر ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ہم بیٹی سے روانہ ہو کر بمبائے پہنچے۔ یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر کر اپنے کاروبار کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یہاں ایک نہایت اچھے

انسان یعنی مشرموہن لال گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب پہلے ایک ہندوستانی تجارتی فرم میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کی گھاڑھی کمائی سے کچھ رقم اس لئے جمع کی تھی کہ وہ ولایت جا کر بیرٹری کی تعلیم حاصل کریں گے۔ چنانچہ وہ، ولایت گئے، مگر وہ جمع کی ہوئی رقم کافی نہ ہوئی۔ اور مجبوراً تعلیم

ادھوری چھوڑ کر واپس آگئے۔ ولایت سے واپس ہونے کے بعد انہوں نے یوگنڈہ کے ایک مشہور مقام اینٹیٹے نامی میں ایک دوکان رکھی۔

مستر موہن لال گاندھی سے ملاقات کی صورت یہ ہوئی کہ جب ہمیں اپنے کاروبار میں دشواری محسوس ہوئی تو ہم نے یہ خیال کیا کہ مسٹر گاندھی ایک لائق و فائق تجربہ کار آدمی ہیں وہ یہاں کے حالات سے بخوبی واقف اور یہاں کے تجارتی رازوں سے ناخبر ہیں ان سے چلکر ملاقات کرنی چاہئے ان کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور اگر وہ اپنی دوکان کے لئے ہلکے کچھ آرڈر دیں تو ہم اوس کی قیمتیں کریں۔ چنانچہ ہم ان سے ملے مختلف عنوانات پر گفتگو ہوئی۔ اور انہوں نے بہت مفید باتیں بتائیں اس کے ساتھ ہی انہوں نے کچھ آرڈر بھی دیا۔

ہم نے اس آرڈر کے مطابق اپنے بسنی کے اڑھتیا سے مال طلب کیا۔ یہاں ایک بات خاص طور پر بیان کرنی ہے۔ وہ یہ کہ اس قسم کی تجارت میں ایک تجربہ کار تاجر کو کسی دوکاندار کا آرڈر لینے اور بسنی کے اڑھتیا سے مال طلب کرنے سے قبل یہ ضرور دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم جس سے لئے بسنی سے اپنی ذمہ داری پر مال طلب کر رہے ہیں وہ کس قدر اعتماد و تاجرانہ رکھتا ہے؟ بازار میں اوس کی ساکھ کیسی ہے۔ اوس کی مالی حیثیت کیا ہے اوس کی موجودہ تجارتی پونجی کس حد تک ہے۔ اور یہ اس لئے کہ جو مال بسنی سے منگایا گیا ہے۔ اگر وہ بالفرض فروخت نہ ہو تو کیا اوس کی قیمت کی دوکان یا فرم سے وصول کی جاسکتی ہے۔ یا نہیں؟ اس کے ساتھ ہی یہ

بھی غور کرنا پڑتا ہے کہ اگر آرڈو دینے والا ناجر بمبئی سے آئے ہوئے مال کی نقد قیمت ادا نہ کر سکا تو کیا یہ مال اس مقام پر پانچ دس فیصدی کم ہر پر سہی فروخت ہو جائے گا یا نہیں۔ ۹

ہم نے موہن لال گاندھی سے آرڈر لے کر بمبئی کے آرٹینا سے اُن کے لئے مال تو طلب کر لیا لیکن مذکورہ بالا باتوں پر نا تجربہ کاری کی بنا پر ذرا بھی غور نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بمبئی سے جیسے مال آیا۔ یہاں اُس مال کی قیمت گھٹ گئی اور مستقبل قریب میں اُس کی کوئی امید بھی نہیں کہ پھر اس مال کی قیمت حسب سابق بڑھ جائے۔ اور کم از کم وام کے دام ہی وصول ہو جائیں۔ گاندھی کی نہایت ہی ایماندار اور خوش معاملہ آدمی تھے۔ انہوں نے اس مال کی کچھ رقم جو اُس وقت اُن سے کسی طرح بھی ادا کی جاسکی ادا کی لیکن پھر بھی ایک بڑی رقم وہ ادا نہ کر سکے۔ ادھر بمبئی کے آرٹینا نے مال کی قیمت کے لئے تقاضے شروع کئے اور وہ تقاضے تلخ سے تلخ تر جوتے گئے۔ یہ رقم کس طرح ادا ہوئی اور کیونکہ اس پھندے سے رہائی ہوئی اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

میرا مضمون کہ انگریز سفر لال گاندھی کے متعلق میری یہ غلط فہمی کہ وہ ایک ایماندار اور نیک اور با اصول آدمی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تجارت کے باب میں بھی کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ میرے لئے بڑی ہی ہمت شکن ثابت ہوئی۔

اس ناکامی نے میرے خیالات یراگندہ کر دیئے تھے۔ اور میں اس حماقت کی تلافی اور آئندہ زندگی کے لئے کسی نئی راہ کی تلاش میں تھا۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وسط افریقہ میں صحاری ہالینڈ ریلوے شروع ہوئی ہے اور وہاں اس سلسلے میں مجھے کوئی نفع بخش کام مل پائے گا۔ ایک دو ہفتے کے مشورے کے بعد میرے اباؤں نے کہا اور بیچتے کر دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ روانہ ہوا اور چندی نامی بندرگاہ پر اترتا جو دریائے زیمبزی (Zambesi) کے دہانے پر واقع ہے۔

جب میں اُترتا تو مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی وہ کہ جب تک کسی مسافر کے پاس کم از کم دس پونڈ نہ ہوں وہ اس بندرگاہ پر نہیں اتر سکتا اور بد قسمتی سے میرے پاس صرف آٹھ پونڈ تھے۔ میرے لئے اس کے سوار کوئی صورت نہ تھی کہ میں رات جہانہ ٹھی پر گزاروں اور دوسرے روز روانہ ہونے والے جہاز پر پھر بمبائے واپس جاؤں۔ چنانچہ مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ اور اس طرح یہ مشککہ خیز سفر بھی میرے میری روداد جہاں پیمانے میں شامل ہوا۔

واپسی میں جزیرہ موناکو کے فرانس میں بندرگاہوں سے گزر کر دو مشہور بندرگاہ گنہنے اور جیجا بھی دیکھنے میں آئے جو اس وقت حکومت فرانس کے قبضہ میں تھے یہاں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ فرانسیسی لوگ ہندوستانیوں کے ساتھ انسانیت، مساوات اور خلوص کا سلوک کرتے ہیں اور ان کو بمبائے کی

۳۸
 کی طرح ذلیل، حقیر اور قابل نفرت نہیں سمجھتے۔ یہاں کے ہوٹل ہندوستانیوں کے لئے بھی ویسے ہی کھلے ہوئے تھے۔ جیسے فرانسیسیوں کے لئے۔

ان ہوٹلوں میں ایک ہندوستانی اسی آزادی اور عزت کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ شراب اور لپے دیگر تفریحی مشاغل انجام دے سکتا تھا، جیسے جڑے پھل، اینٹی لوگ۔ برنٹاف، اس کے بھاسہ کے کسی ہوٹل میں کوئی مغز سے مغز ہندوستانی قیام تک نہیں کر سکتا تھا۔ گوہارے ہندوستان میں بھی چھوت چھات کی ویجا عام ہے۔ مگر مجھے اس کا احساس بھاسہ کے ہوٹلوں اور وہاں کے لوگوں کے خیالات و عمل کو دیکھ کر ہوا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستان میں اس اخلاقی بیماری کو دور کرنے کے لئے ہمارے لیڈروں اور قومی رہنماؤں نے کمر ہمت نہیں پاندی۔ مہاتما گاندھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے چھوت چھات کے خلاف بزور آواز اٹھائی اور انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ انسانیت کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی نہیں کہ وہ انسانیت سے نفرت اور کراہیت کرے۔ غالباً مہاتما گاندھی کو یہ سب جنوبی افریقہ کے قیام ہی دیا جہاں خود انکو ایک کترین اچھوت کی طرح زندگی کے دن کاٹنے پڑے تھے۔

ہمارے رہنمایان نے قوم کے دل و دماغ اچھوت کے خلاف مہم پر کبھی اس حقیقت نے عکس انگلی نہیں کی کہ وہ اچھوت کی لعنت کے خلاف کوئی موثر اقدام کریں اور اسے ہمارے ملک ہندوستان سے نیست و نابود کریں۔ ہماری قومیت ہماری

انسانیت اس سے کس درجہ میوب و مجروح ہو گئی ہے اس کا احساس
ہم کو جب ہوتا ہے جب ہمارے سامنے دوسرے ممالک اور منطقوں کی
آبادیاں آتی ہیں۔

صرف ایک اچھوت ہی کا مسئلہ ایسا ہے جس نے ہمارے ملک کو
ترقی اور روشنی سے محروم کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے تمام لیڈروں
میں صرف ہما تھا گاندھی کا وہ مقدس وجود ہے جس نے اس راز کو ٹھیک
ٹھیک سمجھا اور انہوں نے ”ہریجن تحریک“ کا آغاز کیا۔ اور ان سے جس قدر
ہم سکتا تھا انہوں نے بیخ اوجی کے، انسانیت کش فرق کو مٹانے کی،
کوشش کی۔

ہندوستان میں ہندوؤں کے علاوہ ایک اور بڑی قوم بھی ستی
جسے ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت یعنی مسلمان قوم
کہا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک مستقل مذہب نقل تہذیب اور مستقل
قومیت کے مالک ہیں مگر ان میں اوجی بیج کا یہ فرق نہیں
پایا جاتا۔

ان کی مسجدیں، ان کی عید گاہیں ان کی حج کی عبادت
گاہیں یہ سب شہادت دیتی ہیں کہ ان کے یہاں، انسانیت کی
تفریق نہیں سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نمازین پڑھتے
ہیں سب ایک ساتھ حج ادا کرتے ہیں اور کبھی ان کو یہ تصور
نہیں گزرتا کہ ہم میں کون اوجی بیج ہے برخلاف اس کے ہمارے

۴۰
 یہاں ہر طبقہ کے مندر اور عبادت کدے جدا جدا ہیں۔ اور
 ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنے
 مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ ہمیں اور دوسری اچھی
 باتوں کی طرح اس خصوص میں بھی اسلام کی تعلیمات سے
 روشنی حاصل کرنے میں مطلق تعصب سے کام نہ لینا چاہیے۔

زنجبار - ۹
 مجھے چند ہی بندرگاہ کو آتے اور جاتے وقت قدرے
 زنجبار میں بھی ٹھہرنا پڑا تھا۔ یہ مقام مشرقی افریقہ کا
 سب سے بڑا شہر ہے۔ اور ہندوستانی تاجروں کی بہت بڑی تجارتی
 منڈی ہے۔ اس مقام سے کچھ بھاٹیا لوگ پانچ صدیوں سے زیادہ
 مدت سے تعلق رکھتے ہیں اور انکے ایک زمانے میں کاروبار یہاں کے گوشے
 گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔

مشہور و معروف سیاح و اسکوڈی گاما " جب جنوبی افریقہ کا چکر
 لگا کر زنجبار آیا ہے تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اوس نے کاتا " نامی
 ایک کچی جہاز راہی کو اپنا رہنما بنایا اور اُس کی رہبری میں اُس نے
 اپنے سفر کا ایک معتد بہ حصہ طے کیا۔ یہاں اس وقت بھی خوجوں کی
 کافی آبادی ہے۔ یہ لوگ اب تک اپنے گھروں میں سواحلی زبان ہی
 بولتے ہیں۔ خوجوں کے علاوہ بوہرے لوگ بھی ایک مدت دراز سے یہاں
 مقیم ہیں۔

۱۸۸۵ء تک یہاں کے درآمد و برآمد کا تمام تر تعلق بھاٹیا لوگوں سے

۴۱
 تھا۔ یہ بھاٹیا لوگ یہاں پر کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے یہاں تک کہ
 ”شاہ زنجبار“ کی ساہوکاری بھی یہی لوگ کرتے تھے۔ اور محکمہ کروڑگری
 کی اجارہ داری بھی انہیں کے سپرد تھی۔

حل
 (۱۸۵۸ء تا ۱۸۵۹ء) میں مشرقی افریقہ کا دس میل طویل سا
 جرمن اور برٹش دونوں حکومتوں نے سلطان زنجبار سے ۹۹ سال کے
 ٹپہ پر لیا تھا۔ اور اس حاصل کردہ علاقے کی حکومت کو باہم تقسیم
 کر لیا تھا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد جب انگریزی سرکار کو اس علاقے کی آبادی
 کا خیال پیدا ہوا تو اس نے بمبار سے وکنور یہ نیا نژہ تک ایک پورے
 تقسیم کر کے اور جرمن حکومت نے بھی اس قسم کی ایک ریلوے کی بنیاد رکھی
 ان دونوں لائنوں کی وجہ سے قدرتی طور پر آمد و رفت کے معقول اسباب
 پیدا ہوئے۔ آبادیاں پیدا ہوئیں۔ تجارتی چہل پہل شروع
 ہوئی اور ان تجارتی ہنگاموں، اور کاروباری سرگرمیوں میں مسلمان
 کھوجوں اور بوجھوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ بھاٹیا اور دوسری
 ہندو قوموں نے اپنی مذہبی قیود اور پابندیوں کی وجہ سے اس میں کوئی
 لائق بیان حصہ نہیں لیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہندو قومیں وہاں کا بار
 حیثیت سے ممبر کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ اور ان کا تجارتی وقار
 بالکل ختم ہو چکا ہے۔ کاش ہندو قوم اپنی ان کمزوریوں کا بر محس
 احساس کرتی !

موہن لال گاندھی کیلئے اینٹبے (Entebbe)

میں مہاسہ پہنچنے کے بعد بقیہ رقم کی وصولی کے لئے موہن لال گاندھی کی ملاقات کی غرض سے اینٹبے کو روانہ ہوا۔ یہ مقام یوگانڈا ٹریٹ کا دار الحکومت ہونے کے سبب بہت ہی معروف و مشہور تھا۔ گو اس وقت ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ دس پانچ ہندوستانیوں کی دکانیں اور چند ملازم پیشہ لوگوں کے مکانات بس اس گاؤں کی کل یہی کائنات تھی۔ چنانچہ یوگانڈا ریلوے پر سوار ہو کر پہلے کیسومو گاؤں پر ٹھہرا۔ اور پھر یہاں سے وکٹوریہ نیانزہ میں یوگانڈا ریلوے کے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

چونکہ اس جھیل میں جانجا جزیرے اور نیگیس چٹانیں تھیں اس لئے یہ یہ قاعدہ تھا کہ دن میں جہاز رانی ہوتی تھی اور رات کو کسی جزیرے میں لنگر ڈال دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہمارا جہاز بھی رات گزارنے کے لئے ایک مقام پر ٹھہر گیا اور رات گزار کر علی الصبح روانہ ہوا۔ یہ جہاز اسی روز دوپہر اینٹبے پہنچ گیا۔

یہاں موہن لال گاندھی سے ملاقات ہوئی ان کی دوکان اور دوکان کی مابیت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ رقمی مطالبہ ابھی کئی سال تک نہیں ہو سکتا اور اس ادائیگی میں گاندھی صاحب مجبور ہیں۔ موہن لال گاندھی کے ایسا ندر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن

کاروبار میں اس قسم کی مجبوریات بعض وقت ناگزیر ہو کرتی ہیں۔ ہمارے
 بھئی کے آڑتیا نے ہمارے متعلق بدترین خیال قائم کیا ہوگا۔ اور وہ یہ
 سمجھا ہوگا کہ میں نے عمداً سے نقصان پہنچایا۔ حالانکہ نہ گاندھی صاحب
 کی نیت مجھے نقصان پہنچانے کی تھی اور نہ میرا تصور تھا کہ میں اپنے آڑتیا
 کو نقصان پہنچاؤں۔ میں نے یہاں کے جملہ حالات کی اطلاع دیسائی صاحب
 کو کر دی۔ اور اپنی پیچ در پیچ پریشانیوں سے اُن کو اطلاع کر دیا۔

میں کاروباری ناکامیوں کی بدولت

میری ملازمت - ۱ بہت بدل ہو گیا تھا۔ اور چاروں جانب

سے نت نئی دشواریوں میں پھنس کر حیران تھا کیا کروں۔ بالآخر اپنے ضمیر
 اور مقصد زندگی کے خلاف اس پر مجبور ہو گیا کہ سردست وقت گزارنے
 کے لئے پھر کوئی ملازمت ہی کر لوں۔ اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے
 وہاں کے نائب خزانہ دار صاحب سے ملاقات کی اور اُن سے اپنا مدعا
 عرض کیا۔ انہوں نے مٹرائے۔ ڈی سوزانامی سینئر صیغہ دار سے مجھ کو ملایا
 مٹر موصوف نے مجھے حسابی تختہ جات کی نقل کا کام دیا۔ اور یہ بھی
 ہدایت فرمائی کہ

”یہ نقول فارن آفس (لنڈن) کو روانہ کی جائے گی لہذا نہایت

احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرنا۔“

مجھے اس سے قبل انگریزی میں کام کرنے کا کوئی خاص موقعہ نہیں

ملا تھا کیونکہ امرتلی میں جب میں ملازم تھا تو وہاں تمام کام گجراتی زبان

۴۴
 میں کرنا پڑتا تھا۔ لقل کا کام گو دشوار نہ سہی مگر یہ خیال کہ میری تحریر اتنے بڑے دفتر میں جائے گی، اگر مجھے ذرا بھی فروگزاشت ہوگئی تو بڑا غضب ہوگا۔ اس قسم کی خیالی کمزوری نے میرے دل و دماغ پر اچھی طرح غلبہ حاصل کر لیا اور میری قوت کردار جواب دینے لگی۔

ڈی سوزا صاحب نے تختہ تختہ ایک موٹا پلندہ اور بہت سے پلوں فارم بھی رکھ دیے تھے۔ میں نے پہلے ایک ایسا تختہ منتخب کیا جس میں جہجہ و خرچ کی مدات کی صرف یک سطر ہی تحریر تھی۔ مگر میری مرعوبیت نے مجھے کچھ ایسا مہل سا بنا دیا تھا کہ اسی ایک تختہ کی نقل میں سارا دن لگ گیا۔ اور تقریباً ۱۶ تختے خراب کئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ کسی نے میری کارکردگی کی جانب توجہ نہیں کی ورنہ میرا یہ کام ایسا تھا کہ مجھے پہلے ہی روز ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا۔ دوسرے روز قدرتی طور پر فارن آفس کی مہینت میرے دل سے خود بخود کم۔ اور اس کے بعد سے کام کی رفتار میں تدریجاً تیزی پیدا ہونے لگی۔ اور کچھ دنوں میں پوری دلیری اور مہارت پیدا ہوگئی اس کے ساتھ ہی ساتھ میرے لئے ایک دشواری اور بھی تھی اور یہ کہ انگریزی حکام سے انگریزی میں بات کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ مجھے پہلے سے عادت نہ تھی اس لئے اکثر ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر کچھ دنوں کے بات یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ میں آسانی سے ان کی بات سمجھنے لگا۔ اور روانی کے ساتھ ان سے باتیں کرنے لگا۔

اللہ اللہ کر کے مہینہ ختم ہوا۔ گو میں نے ملازمت کے لئے کوئی تحریری دستاویز

۴۵
 پیش نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی سورہ پیمہ ماہوار کے حساب سے مجھے تنخواہ دی گئی
 جو یہاں اہلکاروں کی ابتدائی یافت ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ،
 یوگانڈا ایڈٹ کی ملازمت پر فائز ہوں۔

یہاں کے سرکاری ملازمین میں اکثر غالب حصہ گوانیز کا تھا۔ چنانچہ
 دفتر خزانہ میں مجھے ملازمت کرنی پڑی تھی اس کے ہیڈ کلرک اور دیگر
 سینئر اہلکار بھی اسی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان میں باہم کچھ ایسا ارتبا
 تھا کہ دوسری کسی قوم کے انسان کو باسانی ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اس دفتر کی مختلف شاخوں
 اینٹے سے جزیرہ بنگایا کو! ا میں ۶ ماہ کام کرنے کے بعد
 میرا تبادلہ اینٹے سے جزیرہ بنگایا کو ہوا۔ اس مقام کے متعلق کسی قدر
 تفصیل دیجیسی سے خالی نہ ہوگی۔

”بوغایا“ دکنوڑیہ نیازہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ میں ہزار
 مربع میل ہے۔ جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرہ بھی ہیں۔ جس میں
 ملکہ ہی گوک بھی اکثریت کے ساتھ آباد ہیں۔ ان میں پچاس فیصد شخص
 ایک عجیب بیماری میں مبتلا تھے جس کا نام سلینگ کنس (Slee-
 Ping Sickness) تھا۔ یہ مرض بہت ہی مہلک
 ہوا کرتا ہے۔ یہ مرض آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے۔ مریض کمزور ہوتے
 ہوتے سال دو سال میں ختم ہوتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو
 اس جان لیوا بیماری میں مبتلا ہو کر صحت یاب ہوا ہو۔ مجھے ایسے افراد

جو گھڑی وغیرہ دینے سے مجبور تھے ایک ماہ تک بیچار پر کام لینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ مزدور لکڑی چیرنے کا کام کرتے تھے۔ ان میں ہر شخص نہایت ہی کمزور و فقیح نظر آتا تھا۔ اور بہت سے تو مذکورہ خطرناک مرض میں مبتلا بھی تھے۔ یہاں کے لوگ چہرہ دیکھ کر پہچان جاتے تھے کہ یہ سیلنگ سکس میں مبتلا ہے۔

یوگیا بھی ایک چھوٹا سا مقام تھا۔ دس ہزار جھونپڑوں پر اس کی آبادی مشتمل تھی۔ میرے قیام پر بھی ایک جھونپڑا جھیل کے کنارے تیار کیا گیا تھا۔ جو یہاں کی سلی آبادی سے دو ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس جھیل ہی پر کچھ موقوف نہیں ہے بلکہ افریقیہ کے کیبو کو۔ مگر مجھ - تقریباً تمام دریاؤں میں مگر مجھ اور دوسرے آبی جانور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان آبی جانوروں میں خطرناک جانور دریائی گھوڑا (Hippopotamus) ہے جسے یہاں کے لوگ کیبو کو سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جانور دن بھر پانی میں رہتا ہے مگر رات کے وقت گھاس چرنے کے لئے کنارے کے خشک حصوں میں آیا کرتا ہے یہ جانور بڑا غضبناک ہے اسے جب غصہ آتا ہے تو سطح آب پر چلتی ہوئی کشتیوں کو الٹ کر غرق کر دیتا ہے۔ اور اکثر گنیڈے کے سینگ جیسے تیز دانتوں سے کشتیوں میں سوراخ کر دیا کرتا ہے۔ یہ جانور گنیڈے سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس کے دو سیدھے اور دو نصف دائرے کی طرح دانت ہوتے ہیں۔ یہ پانی میں رہتے ہوئے بہت ہی دلیر اور بے خوف

ہونا ہی مگر جب جنگی پر آتا ہے تو اکثر کسی آنے جانے والے انسان کے پاؤں کی آہٹ ہی اسے فزاری پر مجبور کر دیا کرتی ہے جب رات کو تاریکی ہو جاتی ہے تو کیوں کو کے غول کے غول میری جھونپڑی کے اطراف میں چرنے کے لئے آیا کرتے۔ ابتدا میں جب مجھے واقعی علم نہ تھا میں ان سے بہت خوفزدہ رہتا اور میرا ملازم بھی ڈرا کر تاہم لوگ ان کے آنے کے اوقات میں گھر سے باہر نکلنے کی ہرگز نہیں کرتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب کشتی میں بیٹھ کر سیروریا کی غرض سے نکلنے لگوں کو کے سرپانی کی چادر سے نکلنے ہوئے دکھائی دیتے مگر یہاں کے ملاح بھی کافی ہوشیار ہیں۔ وہ ایسے اوقات میں ایک خاص آواز نکالتے جس سے وہ کیہ کو پانی میں ڈوب کر گم ہو جاتے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ان کے سر بہت فاصلے پر نکلنے ہوئے نظر آتے۔

کیوں کو کے علاوہ یہاں مگر مجھ بھی کافی موذی ہوتے تھے۔ اکثر انسانی جانیں ان کے سبب سے بھی ضائع ہو کر تھیں ان کے خوف سے گشتے برابر پانی میں جانا بھی اندیشہ سے خالی نہیں تھا۔ یہ اکثر دریاؤں اور جھیلوں سے نکال کر طحہ نالوں میں بھی آ جاتے تھے۔ یہاں کی عورتیں چھوٹے چھوٹے نالوں سے پانی بھرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتیں کہ ایک لمبی لکڑی میں برتن باندھ کر بہت فاصلے سے پانی حاصل کیا کرتی تھیں کہ ان کو اس مقام پر بھی مگر چھپ کا خوف رہا کرتا تھا۔

حکومت انگریزی
 مگر مجھ کے انڈے اور سرہیری جانشین - ہ کے کھونیل آفس
 کی جانب سے سرہیری جانشین کو یوگانڈا کی ہائی کمشنری پر بھیجا گیا تاکہ
 وہ یہاں مقامی حکومت کا انگریزی اقتدار اعلیٰ کے فٹا کے مطابق انتظام
 کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لئے کو ہی دارالسلطنت قرار دیا مگر ان کو عام
 صحرائی اور دریائی جانوروں خصوصاً مگر مجھ اور کیو لو کی کثرت سے
 بہت تشویش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مگر مجھ کے انڈے
 جہاں جہاں سے مل سکیں حاصل کر کے انہیں ضائع کیا جائے تاکہ
 اس خطرناک جانور کی آئندہ کے لئے نسل ہی مسدود ہو جائے۔ یا اس
 میں معتدبہ کمی ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کے احکام نافذ کئے
 کہ مگر مجھ کے انڈے جس قدر مل سکیں حاصل کر کے اور توڑ کر زمین میں دفن
 کئے جائیں پھر کیا تھا اطراف سے بکثرت انڈے آتے ان کو مقامی حکومت
 خرید کرتی اور دفن کراتی۔ لوگوں کو یہ نیا مشغلہ ہاتھ آیا۔ سینکڑوں بلکہ
 ہزاروں انڈے روزانہ آتے یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا مگر انڈوں
 کی درآمد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بالآخر حکومت کو مجبور ہو کر یہ چلنا
 ہی ترک کرنا پڑا۔ کہ مگر مچھوں کی کمی ممکن نہیں۔ اس علاقے میں مگر مچھا اور
 دریائی گھوڑے (کیوگو) اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ شکاری ان کے
 شکار کرنے کو کارٹوس کا ضائع کر دینا سمجھتے تھے۔

۴۹
 دو حادثے ؟ قیام بگایا کہ زمانے میں مجھے دو ایسے
 ہولناک حادثے پیش آئے کہ اگر قدرت

کا رسازی نہ فرماتی تو میں یقیناً مر چکا ہوتا۔ اون میں سے ایک حادثہ
 ڈریائی، کہ میں ڈوبتے ڈوبتے بچا اور دوسرا حادثہ ”سانپ“ کا ہے ان
 دونوں ہولناک حادثات کی قدرے تفصیل خالی از دھجپی نہ ہوگی

خونی لہروں کے منہ سے نکلنا ایک روز میں ساحل دریائے کنارے
 تنہا سیر کر رہا تھا کوئی ماہی گیر ایک

چھوٹی سی کشتی کنارے پر باندھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ ایسی کشتی بہت ہی
 ہلکی پھلکی ہو کر تھی۔ ہے جسے مشاق چلانے والا ہی چلا سکتا ہے۔ اور اس
 کے چلانے میں توازن کو قائم رکھنا خاص بات ہے ورنہ یہ خیال کہ چھوٹی
 سی کشتی ہے اس کے چلانے میں کیا دشواری ہوگی و حقیقت خطرناک

غلط فہمی ہے۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوا۔ میں نے کشتی کبولی اور سیر
 دریا کے جنٹ نے مجھے اس کے چلانے پر مجبور کیا۔ میں اسے کھینے کھینے کنارے

سے بہت دور نکل گیا۔ مجھے چونکہ پہلے سے کشتی رانی کا کوئی تجربہ نہ تھا
 میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا کشتی الٹ گئی اور میں پانی میں گر گیا

میں نے اندازہ کیا تھا کہ کشتی پانی کی تہ تک پہنچ گئی ہوگی مگر واقعہ
 یہ تھا کہ کشتی اتنی ہلکی تھی کہ وہ پانی ہی پر تیرتی رہی۔

میں ادنی سوٹ میں تھا۔ پاؤں میں وزنی بوٹ تھا۔ تیرنے
 وقت مجھے اس کا سجد خوف تھا کہ کہیں گہرے پانی کا لقمہ نہ بن جاؤں۔

میں اسی دہشت میں چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں کوئی دریائی جانور تو نہیں ہے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکبے کے میرے اطراف میں کہیں کسی جانور کے ہونے کے آثار نظر نہیں آئے پھر بھی دہشت بستور تھی۔ میں برابر تیرنا رہی جاتا تھا۔ مگر ابھی گنارہ کوئی ۲۵ فٹ کے فاصلہ پر تھا کہ میرا دم پہونے لگا اور میرے ہاتھ پاؤں نے یکایک جواب دے دیا۔ بالآخر میں نے یہ سمجھ لیا کہ میری زندگی کی آخری سانسیں ہیں اور میری نگاہوں کو جو کچھ اس وقت نظر آ رہا تھا وہ دنیا کا آخری منظر ہے میں اس وقت بالکل بے حس و حرکت تھا اور اپنے کو موجوں کی تندرک چکا تھا کہ یکایک یہ محسوس ہو کہ میرے پاؤں کسی سخت اور ٹھوس چیز سے مس ہو رہے ہیں غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ زمین ہے اور مجھے فضل خداوندی کی لہروں نے گنارے پہونچا دیا اب میرے سامنے خشکی کا منظر تھا۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میرا دل اعتراف کر رہا تھا کہ قدرت کی کرم فرمایوں نے مجھے خونی لہروں کے منہ سے نکال کر رمل مراد تک پہونچایا ورنہ غرق دریا ہونے میں ذرا بھی کسر باقی نہیں رہی تھی۔

دو مراد واقعہ سانپ سے متعلق ہے۔ میں

سانپ کا مقابلہ - ایک شب کو تقریباً ۸ بجے قندیل لے کر

قضا حاجت کے لئے بیتا بخلا گیا۔ یہ بیتا بخلا کوئی چار مربع فٹ کا ایک کوٹھری تھی۔ جس کا دروازہ عرض میں دپڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ میں اندر بیٹھا ہی تھا کہ یکایک ایک بٹھا کا لاسانپ زبان کھینچ کر

اور کبھی باہر کرتا ہوا دروازے سے نکل کر میری جانب آتا ہوا نظر پڑتا اور میرے پاس اس کے شر سے بچنے اور جان بچانے کے لئے کوئی آلہ نہ تھا صرف پانی کا ڈبہ اور ہرکیں لائٹن میرے پاس تھی اور ظاہر ہے کہ سائب کے سر کھپنے کے لئے یہ دونوں چیزیں بیکار تھیں یہ خیال بھی آیا کہ سپرین کی طرح ایک ہاتھ سے اس کا سر اور دوسرے ہاتھ سے اس کی دم پکڑ کر اسے بلاک کرنے کی کوشش کروں۔ مگر میں ایسا بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کی دم بیت انخلا کی کوٹھری کے باہر تھی۔ جو کسی طرح گرفت میں نہ آسکتی تھی۔ اس خیال کی ناکامی نے مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔

اب اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ میں اپنے آپ کو سائب کے رحم و کرم پر بالکل چھوڑ دوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ میں نے دیکھا کہ سائب کہتے کہتے بالکل تبدیل کے قریب آ گیا۔ اور اس کا منہ قندیل سے لگ گیا۔ قندیل میری داہنی جانب صرف ۸، ۹ انچ کے فاصلہ پر ہوگی اب اس نے قندیل کے چاروں طرف گھیرا ڈالتا شروع کیا۔ اس گھیرے میں اس کا منہ میرے داہنے پاؤں سے چار پانچ انچ کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ میرا کلبچہ اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔ کہ اب اس نے مجھے ڈسا، اب میں موت سے دوچار ہوا۔ مگر اس موقع پر بھی صدمے نشل فرمایا۔ اور وہ سانپ لہتہ لہتہ میری داہنی جانب بڑھا میرے دو نور پاؤں کے سامنے سے ہو کر آگے کی جانب جانے لگا۔ میں نے اپنے پرانے حواس درست کئے اور اس موقع کو فضیلت سمجھ کر میں ہنایت ہی آہستگی نے ساتھ

کھڑا ہوا۔ اور میرے کھڑے ہونے کے بعد ہی سانپ کی رفتار اور اس کے
 رُخ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ برابر میری داہنی جانب
 جا رہا تھا مگر تبدیل میں جو گھیراؤں نے ڈالا تھا وہ ابھی تک پوری طرح نہیں
 کہا تھا۔ اب میرے سامنے صرف یہی ایک صورت تھی کہ ہمت کر کے دیا
 بھانڈ جاؤں۔ اور اس طرح اپنی جان بچاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا
 باہر نکلنے کے بعد اتنا بے حفاظت کے خیال و سعی کی جگہ خوف و دہشت
 نے لی۔ اب میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ تمام جسم لپینے میں شہاؤ
 میں نے بہت چاہا کہ آواز دیکر لوگوں کو بلاؤں مگر دیر تک منہ سے آواز نہ
 نہیں نکلی۔ چند لمحوں کے بعد اڑے ہوئے حماس واپس آئے۔ دل کی
 دُشمنی میں سکون پیدا ہونے لگا۔ منہ سے آواز نکلنی شروع ہوئی۔ میں
 نے لوگوں کو آواز دی۔ وہ آئے سب نے ملکر اُس مہلک اور جان لیوا سانپ
 کو ہلاک کر دیا۔

دریائے نیل کا منبع کشتی میں بیٹھ کر جنجنا نامی بندرگاہ کی سیر کو گیا
 میں یوگا کے قیام کے زمانے میں اپنی چھوٹی
 سی قیام پر دریائے نیل کا منبع ہے۔ جو اسی جھیل و کٹورہ نیازہ میں نکل
 ہے۔ یہاں جھیل کا پانی تقریباً ۲۵ فٹ کی بلندی سے گر کر روان
 ہوتا ہے۔ اس کا نام دریائے نیل ہے۔

دونوں قابل فراموش ملاقاتیں۔ اسی جنجنا میں ایک دکنی صاحب
 یعنی ڈاکٹر وٹھل راؤ لاند

سے تعارف کی عزت حاصل ہوئی جو یہاں بحیثیت سب اسٹنٹ سرحد
 متین تھے اور پھر انھیں کے ذریعہ سے ایک دکنی مسلمان محمد یوسف
 نامی اور ان کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی۔

یہ دونوں ملاقاتیں ایسی مخصوص اہمیت رکھتی ہیں کہ میں انکو اپنی
 زندگی تک فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر لائڈے کی ملاقات اور پھر ان سے تعلقات کے نتیجے میں یہ
 ہوا کہ ان کی بھانجی سے میری شادی ہو گئی اس طرح مجھے ایک نہایت ہی
 مناسب و موزوں رفیقہ حیات اور شریکِ نعم مل گئی۔

محمد یوسف اور ان کی اہلیہ کی ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے انھیں
 لوگوں کی بدولت پھانسی کے تختے پر لٹکنے کی نوبت آئی۔ اس واقعہ کی
 تفصیل اسی کتاب میں کسی مناسب موقع پر درج ہے۔

ڈاکٹر لائڈے ایک نہایت نیک نفس، پاک باطن اور قوم
 و وطن کے سچے و درندہ تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ خلق ہی میں بسر
 ہوتا تھا۔ عدانے ان کو بہت کچھ دولت دی، جسے انہوں نے نیک کاموں
 میں صرف کیا۔ انہوں نے کروے زمانہ یونیورسٹی کو ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰)
 کا فیاضانہ عطیہ دے کر مرہٹہ قوم پر ایک غیر فانی احسان کیا۔ ڈاکٹر
 نے اس رقم سے ایک زمانہ ہائی اسکول پونہ میں قائم کیا اور
 اس کا نام وٹیل راگھو بالائڈے ہائی اسکول رکھا۔

ڈاکٹر لائڈے ۱۹۱۷ء میں بیک دائرے کے سہلک مرض میں مبتلا

ہو کر انتقال کر گئے۔۔۔ گرووں کی نیکیاں اور نیکیوں کی یادگار اب تک قائم ہے۔

بگایا میں جب میں برس ملازمت تھا تو فطری ذوق پھر اٹھنے میں نے پھر مجھے تجارتی کاروبار کے لئے گدگدایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں۔ میں نے، سب بکروں کی کھالوں کی تجارت کو منتخب کیا اور ایک نوکر رکھ کر یہ بیوپار شروع کیا۔ صورت یہ تھی کہ مضافات سے مال جمع کرانا اور کشتی کے ذریعے اینٹے کی بازار میں ان کی کہیت کرانا۔ اس کاروبار میں۔ مجھے فائدہ ہوا مگر اسے کیا کیا بدلے کہ جب مال نمیری مرتبہ روانہ کیا گیا تو ملازم تمام صل و منافد لے کر ایسا فائب ہوا کہ پھر آج تک پتہ نہ چلا۔

اس جزیرے میں مجھے ابھی چھ ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ پھر مجھے کلکٹر آفس میں ایک اہلکار کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے اہلیت ہی میں بلا گیا۔ چنانچہ میں حسبِ حکم روانہ ہو گیا۔ اس وقت یہاں کے کلکٹر صاحب صاحب جزیرہ مالٹا کے رہنے والے مسٹر جمیس مارٹن تھے یہ صاحب کلکٹر تھے مگر نوشت و خواند سے بالکل نا بلد۔ معلوم نہیں کتنے فاقوں میں انہوں نے (T. M.) جے۔ ایم۔ دو حروف اپنی دستخط کے لئے یکجہ لئے تھے۔ اگر گورنمنٹ کے کلکٹر کے لئے سرکاری کاغذات پر علامت ابہام یا کندہ و تراشیدہ مہر کو ثبت کرنا جائز ہوتا تو شاید مسٹر جمیس مارٹن صاحب ان دو حروف کے سیکھنے کی بھی رحمت نصرتے۔

مستر جیمس نارٹن باوجود ان پڑھ ہونے کے بہت ہی ہوشیار اور فرسی تھے۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت سے کسی نہ کسی طرح کلکٹری کی گاڑی چلا ہی لیتے تھے۔ ان کے دو یورپین مددگار بھی تھے۔ جن کی مدد سے وہ اپنے اس اہم عہدے کو نبھائے جا رہے تھے۔

لٹے کاغذ پر دستخط
میں جب ان کے پاس کاغذات دستخط کرانے کاغذ پر دستخط کرنے کی غرض سے لیجا یا کرتا تو مجھے خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا کیونکہ میں ذرا بھی غفلت کروں تو کلکٹر صاحب بجائے سیدھے کاغذ پر دستخط کرنے کے لٹے کاغذ پر دستخط کر دیں۔ ایسا کئی بار سوچا تھا کہ انھوں نے لٹے کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ مجھے شرمندہ ہونا پڑا کہ میں نے کیوں نہ احتیاط سے کام لیا۔ اور یہ کیوں نہ دستخط کرتے وقت یہ خیال کیا کہ صاحب کس رنج پر دستخط کر رہے ہیں۔ آپ حیرت کرین گے کہ جس شخص کو سیدھے اور لٹے کاغذ میں تمیز تک نہ ہو اسے گورنمنٹ نے کلکٹری کے عہدے کے لئے کیوں تجویز کیا لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ افریقہ والوں پر حکومت برطانوی کی جو نگاہ تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ ان پر ان کے یہاں کے ایک سخت آدمی حکومت کرے۔ جو ان کے حالات سے بہت واقف اور وہاں ہر ذمہ دار بھی ہو۔

ایک بات قابل بیان ہے وہ یہ کہ اس وقت یہاں کے اسٹنٹ کلکٹر کی تنخواہ تین سو بارہ (۳۱۳) روپیہ ماہانہ اور کلکٹری کی ابتدائی تنخواہ پانچ سو (۵۰۰) روپیہ ماہانہ اور بلکار کی ابتدائی یافت ایک سو

(۱۰۰ روپیہ) ہوا کرتی تھی۔ آپ غور فرمائیے کہ ہندوستان میں کلکٹر اور اہلکار کی تنخواہ میں جو تفاوت ہے اس سے کہیں کم یہاں کے کلکٹر اور اہلکار کی تنخواہ میں ہے

جب میں یوگانڈا آیا ہوں تو اس سے قبل یہاں چند اچھے ہندوستانی اشخاص معزز عہدوں پر تھکن تھے۔ ان میں پونہ کے مشہور ڈاکٹر مشرم رام جی کھلے کے فرزند راجندر مسٹر ملندراؤ کھلے بھی تھے جو انٹینسٹی ریاست کے صیغہ فوج کے ہیڈ کلکری پر فائز تھے۔ ان کا مشاہرہ دو سو بارہ روپیہ آٹھ آنے (۲۰۸-۲۱۲) روپیہ اٹھ آنے تھا۔ ان کا ابتدائی تقرری اسی عہدہ پر پہلے وسطاً فریقہ میں براہ راست انگلیڈ سے عمل میں آیا تھا۔

یہاں ابھی کام کرتے چند ماہ مشکل گزرے تھے نیمولے میں کہ میرا تبادلہ نیمولے کو کر دیا گیا۔ یہ مقام دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے۔ جہاں پونچنے کے لئے (پیا دہ پا) تقریباً ایک ماہ کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔

نیمولے صوبہ نیل کے صدر مقام ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر یہاں آب و ہوا بحد ضرر رساں اور دشمن صحت ہے اسی سبب سے اکثر سرکاری ملازمین کو چھ ماہ بعد بھی مجبوراً تبادلہ کرنا پڑتا ہے۔ یوگانڈہ کا پورا علاقہ میرا زدہ ہے مگر نیمولے خاص کر زیادہ ہیبتناک ہے۔

مجھے نیوے کی خرابی آب و ہوا معلوم تھا مگر میں وہاں جانے پر
 بخوشی راضی ہو گیا۔ بخوشی راضی ہونے کی وجہ، آگے غا ہر ہو جائیگی
 چونکہ میرا سینٹے سے نیوے کو سفر کرنا سرکاری اغراض و احکام
 پر مبنی تھا۔ اس لئے میرے سفر میں سرکاری جانب سے ہر ممکن سہولت
 فراہم کر دی گئی تھی۔ مگر گدھا، خچر، گھوڑا، اس سفر میں کسی طرح اور کسی
 قیمت پر نہیں میسر آ سکتے تھے۔ کیونکہ راستے میں زہریلی مکھیوں کی وہ
 کثرت ہے کہ الامان! کوئی جانور ان کی زد سے جان بچا کر نہیں گزر
 سکتا۔ اس لئے سفر کی زیادہ سے زیادہ دو صورتیں ہیں یا تو پیدل
 چلا جائے یا جھولی میں بٹھیکر یہ مسافت طے کی جائے۔ سرکاری
 جانب سے مجھے ۲۰ مزدور دیئے گئے تاکہ وہ میرا سامان لا کر پہنچا
 سرکاری ملازم ہونے کے سبب مجھے یہ سہولت بھی دی گئی کہ میں آگے
 بڑھ کر بوٹیا با سے بجائے بری راہ کے دریائی راہ اختیار کروں اور
 دریائے نیل میں کشتی پر بٹھیکر یہ راستہ طے کروں اس دریائی راہ
 میں دو آسائیاں ہیں۔ اول تو پیدل چلنے کی صعوبت سے نجات دوسرے
 راستہ کا مختصر ہونا کیونکہ خشکی کا راستہ جس سے علی العموم تھرا اور
 دوسرے عام لوگ سفر کرتے تھے خطرناک اور دشوار ہونے کے علاوہ
 طویل بھی تھا۔

لوہے کی کشتی میں سفر یہاں لوہے کی کشتی جو بادبان سے آراستہ تھی
 میں سینٹے سے روانہ ہو کر بوٹیا با پہنچا،

ہلی اس پر ہٹھکے میں نے دریائی سفر شروع کیا۔ یہاں سے دریائے نیل کی روانی تک پہنچنے میں تقریباً چھ گھنٹے صرف ہوئے۔ یہ سفر گو خشکی کے سفر کے مقابلے میں کم طولانی تھا لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ خاصکر ایسے اوقات میں جب نہایت فرائے کی بے پناہ، اور غیر منظم ہواؤں کا زور ہوتا اور دریا کی جونی لہریں اٹھ اٹھ کر کشتی کو زیر کرنے کی کوشش کرتیں، میں گو خطرات راہ کا پہلے۔ سے کسی قدر جوگر تھا مگر پھر بھی اپنے دل میں طوفانی ہواؤں کے چلتے وقت ایک نہت سے بہری ہوئی کیفیت محسوس کرتا اس سفر میں بعض مواقع سید انسطراب آفریں آئے، اور سخت ہولناک منظر نگاہ کے سامنے گزرے۔ اگر بادبا کی ڈوریاں بہت ہی غیر معمولی مضبوط و مستحکم نہ ہوتیں۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کشتی الٹ کر مجھے تہہ آب نہ کر دیتی اور میں ہمیشہ کے لئے صفحہ روزگار سے نہ مٹ جاتا چلتے چلتے جب کشتی دریائے نیل کی نین روانی میں پہنچی۔ (جہاں سے دونوں جانب خشک زمین نظر آتی تھی) تو بہت ہی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

یہ دریائی راہ تیرے روز طے پاگئی۔ اور میں اللہ اللہ کر کے

نیمولے پہنچا۔

نیمولے آنے کی خوشی ہی دشمن جان جگہ تھی مگر میں نے یہاں آنے میں ایک خوشی محسوس کی جیسا پہلے کبھی ہوں۔ اس احساس مرت

کی وجہ۔ یہ ہے کہ قدرت نے میری فطرت میں تجارت کا مذاق و دلچسپی رکھا ہے اور اس مذاق کی پرورش میں نیمولے میں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ تمام ہاتھی دانت کا مرکز تھا۔ یہاں سے ملک کا گلو کو ہاتھی دانت بکثرت جاتا تھا۔ صحرائی لوگوں کے مذاق کی چیزیں۔ رنگین کپڑے تانبے اور پتیل کے چکدار تار رنگ برنگ کے پوتے، خوبصورت آئینہ اور کلابتوں کی لیسیں وغیرہ اور اس قسم کی دوسری نمائش اور بھولے بھالے تمدن نا آشنا لوگوں کو مرغوب پسند آنے والی چیزیں عرب سنجار برطانوی سرحد سے اس علاقے میں لاتے اور ان کے تبادلے میں ہاتھی دانت لیجانے یہاں کے صحرائی کاروباری لوگ سکھ کی قدر و منزلت سے بالکل بے بہرہ تھے، اس لئے عربوں سے ان کی معاملات بجائے نقد رقم کے مذکورہ الصدہ اشیاء سے ہو کرتی تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک ایک عرب تاجر پچاس پچاس سوسو۔ دو دو سو، بلکہ بسا اوقات چار چار سو مزدوروں پر مال لا کر لاتا۔ اور دو ایک سال کے بعد انہیں مزدوروں پر ہاتھی دانت لا کر لے جاتا۔ پہلے یہ سودا گرز سنجار اور بجا گامو لو کی بندرگاہوں میں سے ہوتے ہوئے۔ خشکی کے راستے کو پیادہ پاٹے کرتے ہوئے تھانگو کے علاقے میں آیا کرتے تھے۔ لیکن یوگانڈا ریونے کی تعمیر کے بعد سہولت پیدا ہو گئی۔ اور یہ تجارتی کاروبار براہ راست نیمولے سے ہونے لگا۔

مختصر یہ کہ میں نے اول اول ہاتھی دانت کی تجارت۔

تجارت، کرنی چاہی اور میرا یہ ارادہ نیمولے آنے کے وقت ہی

ہو گیا تھا مگر اس درمیاں میں رام بھاؤ لوکھنڈے صاحب کو جو ملازمت کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان کو دوسرے محب وطن مرٹھوں نے اس کا روبرو کر کے لئے مالی امداد بطور قرضہ دی۔ اور ان کو میرے ساتھ کر دیا۔ میں جب نیموے پہنچ گیا تو میں نے مسٹر لوکھنڈے کے لئے بازار میں ایک دوکان تیسر کرانی۔ جس کی تیاری پراو سے عام پسند پارچہ جات اور دیگر سامان تجارت سے مزین کیا گیا۔

رام بھاؤ لوکھنڈے کی اچانک موت میں نے عربوں کے طرز تجارت کی پیروی کرتے

ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ رام بھاؤ بھی مال سے کر دورہ کریں۔ چنانچہ میرے خیال و مشورہ کے مطابق ایسا ہی ہونے لگا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ہم اس تجارت میں کامیاب ہوں۔ چنانچہ بیچارے رام بھاؤ یہاں آنے کے چار ماہ بعد بلیک وائر کے جان لیوا سنجار میں (جو یہاں وہاں عام کی حیثیت رکھتا ہے) مبتلا ہوئے اور چار روز بیمار رہ کر پانچویں روز انتقال کر گئے۔ مجھے اس حادثہ سے بہت ہی سخت صدمہ ہوا۔ اول تو مسٹر رام بھاؤ لوکھنڈے کی غریب الوطنی کی موت کا غم اور پھر اس کے بعد اس کا بھی افسوس کہ ہم نے جو کاروبار کیا تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ بالآخر لوکھنڈے آجہانی کا تمام پھیلایا ہوا کام مجھے سمیٹنا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد مسٹر گھیلے اور مسٹر جوش نے قرض کی رسیدیں مجھے پس کر دیں۔ بالآخر یہ لے پایا کہ اس تجارت میں جس قدر رقم لگی ہے اسے کسی

نہ کسی طرح فراہم کر کے آجہانی کی اہلیہ کے پاس بھیج دینا چاہئے۔ اس رقم کے انتظام کے لئے ہائی کورٹ سے مجھی کو رسیور مقرر کیا۔ اس تمام کوشش کے نتیجے میں کل چھ سو روپیہ فراہم ہو سکے میں نے ان کی اہلیہ کے پاس بھیجنا چاہا مگر ان کا پتہ نہ چلا۔ بالآخر تین سال کے بعد ہائی کورٹ نے انڈیا گورنمنٹ کے ذریعہ پتہ چلا کر یہ ساری رقم دن کی اہلیہ کے پاس روانہ کر دی۔

رام بھائو لوکھنڈے کی موت کا
میری خطرناک علالت - ۶ صدر اکبر بھی میرے دل سے مٹنے نہیں پایا تھا اور ان کو دنیا سے سدبارے ہونے ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ میں بھی اسی خطرناک مرض بلیک واٹر میں مبتلا ہو گیا۔ جس میں لوکھنڈے کی جان جاچکی تھی۔ اور ان کے علاوہ ہر سال سیکڑوں انسان اسی مہلک بیماری سے روانہ عدم ہوتے رہتے تھے۔ میرے دل پر اپنی زندگی کی جانب سے یاس چھا گئی۔ ڈاکٹر صاحب بھی بستی میں موجود نہ تھے۔ خود پروانٹل کشنر صاحب ازراہ کریم میری قیام گاہ پر تشریف لا کر اس مرض کی مفروضہ دوا مجھے پلا یا کرتے۔

چونکہ ابھی میری زندگی باقی تھی اس لئے خدا کے فضل سے ایک ہفتہ میں مجھے اس مرض سے نجات مل گئی۔ مگر میری کمزوری میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر نے اس دشمن صحت جگہ سے تبادلہ کی باضابطہ سفارش کی۔ جس نے قبولیت

۶۲
حاصل کی اور میرا تبادلہ نیولے سے منڈی کو ہو گیا۔

رشتہ ستانی کے موقع جب تک میں نیولے میں رہا پرنٹل
کشنز کا میرٹھی رہا۔ یہ عہدہ اختیار

داثر کا تھا اس لئے اگر میری جگہ پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید مشکل
ہی سے وہ اپنے آپ کو رشتہ ستانی سے محفوظ رکھ سکتا۔ میرے پاس
اہل غرض اور صاحبان معاملہ آتے اور اپنی ضروریات و مشکلات کو رفع
کرنے کے لئے پیش قدمیاں میرے سامنے پیش کرتے مگر میں خدا کا لاکھ
لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا دل کبھی ان ناجائز رقموں کی جانب نہیں
جھکا جس کا جو کام جائزہ کے اندر ہوتا اُسے میں خود ہی انجام دیتا
اور ناجائز کام کی انجام دہی کے لئے میرے پاس انکار کے سوا اور کچھ تھا

ڈاکٹر اسٹونی کے ہاتھی نے ٹکڑے کر کے
نیولے میں ایک اور
ہنایت ہی افسوس

ناک واقعہ مشاہدہ میں آیا جس کا اثر میرے قلب پر اس وقت تک
ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر اسٹونی جو یہاں کے ڈیکل آفیسر تھے اور جن
کے زیر علاج ہمارے آنجنائی دوست سٹر لوکھنڈے بھی رہے تھے۔
ایک روز ہاتھی کے نزدیک آنے کی خبر پا کر اپنے اردلی کے ساتھ اُسے
شکار کرنے کی غرض سے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک بڑی بندو
تھی اور ان کے اردلی کے پاس بھی ۳۰۲ بور کی ریگولیشن رائفل تھی۔ یہ
جب اُس مقام پر پہنچے جہاں ہاتھی سامنے ہی تھا تو انہوں نے اُس پر

بندوق چلائی غالباً نشانہ خطا ہو گیا اور ہاتھی مشتمل ہو کر اداں پر حملہ آور ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے متوازن فریئر کے تقریباً دو درجن کارتوس جو ان کے پاس تھے سب ہی صرف ہو گئے اور ان کا اردنی بھی برابر فریئر کرتا رہا۔ مگر سب بے اثر ہوا۔ ہاتھی نے جھپٹ کر ڈاکٹر صاحب کے پاؤں کو سونڈ کی گرفت میں لیا اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں نہایت بیدرداں پٹنخ دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک پاؤں سونڈ میں اور دوسرا کمرے الگ ہو کر دور فاصلہ پر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس واقعہ کی اطلاع نیولے پہنچی لوگ دوڑ کر آئے مگر ڈاکٹر صاحب کی روح پرواز کر چکی تھی اور ہاتھی بھی (جو بندوق کی گولیوں سے کافی زخمی ہو چکا تھا) تڑپ تڑپ کر مچکا تھا جیسا ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میرا تبادلہ نیولے

مسند میں سے

مسند میں سے سنڈی کو ہو گیا۔ چنانچہ میں آہنی کشتی کے ذریعے دریائے نیل کو عبور کرتے ہوئے بوٹیا یا آیا۔ اور وہاں سے خشکی کی راہ لی تین چار یوم کے بعد مسند ہی پہنچا۔

یہ سنہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ یہ تمام علاقہ ایک اسٹنٹ کلکٹر کے تحت انتظام تھا۔ کلکٹری کا پورا عملہ دو شخصوں پر مشتمل تھا ایک کلکٹر اور دوسرا میں جو اداں کی نیابت و اہلکاری کے فرائض انجام دیا کرتا تھا یہ بھی عجیب ویران مقام تھا۔ اشیاء ضروری تک دستیاب نہیں ہوتی تھی تمام بستی میں صرف تین چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں ان میں دو ہندو تاپا اور ایک عرب کی دکان تھی۔ یہاں نہ کوئی دوا خانہ تھا اور نہ ڈاکٹر

جیب کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کے لئے ۳۵ میل کی مسافت سے ڈاکٹر
 بلا یا جاتا جو مقالہ *Alloima* ہائیمیا میں رہتا تھا۔

اسٹنٹ کلکٹر ہاتھی کے شکار ہو گئے۔ میں نے یہاں آکر یہ واقعہ
 سال قبل یہاں کے مختار مطلق یعنی اسٹنٹ کلکٹر بھی ہاتھی کے شکار کرنے
 میں خود شکار ہو گئے۔ اور موذی ہاتھی نے صاحب بہادر کو پیکر مرانا
 اور کسی قسم کی طبی امداد ان کی جان رفتہ کو واپس نہ لاسکی۔ یہاں اس
 قسم کے دردناک حادثے اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں ہاتھی کے مارے ہوئے
 اسٹنٹ کلکٹر کی موت کے بعد یہاں کا انتظام عارضی طور پر پولوی عبدالکریم
 صاحب نے ایک نیک مسلمان کے سپرد ہوا۔ یہ در اس کے رہنے والے تھے
 اور ان میں انتظام کی خاص قابلیت تھی اور ہر طرح اس کے مستحق تھے۔ کہ
 ان کو ٹرے بڑا متقل عہدہ دیا جائے۔ چنانچہ ان کے والد جو ایک وظیفہ
 یاب صوبہ دار تھے، درجن کے وفادارانہ احسانات برطانوی حکومت
 پر تھے، انڈیا آفس کے ذریعہ کلونیل آفس (Colonial Office)
 میں بہت کوشش کی کہ لائق و فائق بیٹے کا اسٹنٹ کلکٹری پر متقل تقرر
 ہو جائے۔ یوگانڈا کی مقامی حکومت نے بھی پر زور تصدیق کی تھی کہ
 عبدالکریم ہر طرح اسٹنٹ کلکٹری کے لئے نہ صرف موزوں بلکہ ہر عنوان
 سے بہترین شخص ہیں لیکن اتدرا اعلیٰ نے صاف انکار کر دیا کہ فی الحال
 کسی بند و تثنائی کو ایسی ذمہ دار نہ متقل ملازمت نہیں دی جا سکتی۔

میرالقر - مولوی عبدالکریم صاحب اقتدار اعلیٰ کے
 اس جواب سے بہت بد دل ہو گئے۔ اور انہوں
 نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس طوق ملازمت کو گھلے سے نکال دیں۔ چنانچہ
 اس سلسلہ میں پہلے انہوں نے ایک طویل رخصت حاصل کی۔ اور ہندوستان
 چلے گئے اور پھر دوبارہ اپنی ملازمت پر واپس نہیں آئے۔ اون کے
 جانے کے بعد میرالقر اون کی جگہ پر ہوا۔

اہلکاری کے پردے میں سٹینٹ کلکری
 ہمارے دفتر کو دیوانی اور فوجداری دونوں
 کے کمال اختیارات حاصل تھے۔ کلکٹر صاحب سال میں چھ ماہ دورے
 پر رہتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ابا وجود ایک اہلکار ہونیکیا
 تقریباً سارے اختیارات مجھے حاصل ہو جاتے تھے۔ یہاں یہ دستور
 تھا کہ متینٹ کے جملہ عذرات اور فریقین کے تصفیے زبانی ہوا کرتے
 تھے۔ خواہ دیوانی کے ہوں یا فوجداری کے چونکہ مجھے وارنٹ پر
 دستخط کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس لئے مجرموں کو بغیر وارنٹ ہی کے
 گرفتار کر کے قید میں رکھنا پڑتا تھا۔ ملکی لوگوں کے مقابلہ میں جب کوئی
 استغاثہ ہوتا تھا تو اس کی سزاتاً زبانی نہ زنی کی صورت میں زبانی
 سنادی جاتی تھی اور اس کی اس وقت تمیل بھی ہو جاتی تھی۔ اس قسم
 کی سزا عام طور پر اسے ۲۴ تا ۳۰ یا نوں تک ہوا کرتی تھی۔

حکام کارویہ ماتحتوں کے ساتھ) جب میں سنڈی (MASINDI)

آیا تو اُس زمانہ میں ایک نئے اسٹٹ کلکٹر صاحب کا بھی تفریحی عمل میں آیا تھا یہ اپنے ماتحت ہندوستانیوں اور گوانیز کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے انگریز حکام بھی عام طور پر خوش رویہ ہوتے تھے لیکن کچھ ایسے افسر بھی گاہے گاہے آجاتے تھے۔ جن کا سلوک اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا نہ ہوتا تھا۔ اور عملے کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ اور اکثر مارنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔

میرے قیام سنڈی کے زمانے میں یکے بعد دیگرے تین اعلیٰ عہدہ دار آئے مگر تینوں کا اخلاق میرے ساتھ نہایت ہی اچھا رہا اور میری انسانیت کو ان کے عادات و اطوار سے کبھی کوئی گھلہ نہیں کرنا پڑا۔

مسٹر انڈرسن کی تشریف آوری کافی عرصہ کے بعد یہ خبر ملی کہ ایک نہایت ہی سخت اندرسن نامی انگریز کلکٹر موکر سنڈی آنے والا ہے۔ یہ اپنی بد مزاجی کی وجہ سے اس علاقے میں بہت بدنام تھا اور لوگ اس کا نام سننے ہی گھبرا اٹھتے تھے۔ ان کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے ایک ہندوستانی عیسائی اہلکار جوزف (JOSEPH) نامی کو مارا تھا

جو حیدرآباد دکن اکا رہنے والا تھا۔ مگر جوزف صاحب بھی تسلیم
 درصنا کے خوگر تھے وہ مارکھا کر خوش رہے اور انہوں نے اپنی ذلت
 کا ذرا بھی احساس نہ فرمایا اور بدستور اس ملازمت کو اختیار کئے
 رہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو داری کا خون کر کے رزق حاصل کرنا،
 انتہائی بے غیرتی ہے۔ ایسی شکم پڑی جس میں انسانی رُوح اور بشری
 اسپرٹ کی تذلل ہو، مشغل طامت ہے۔

تقسیم فرانس نے عہدہ داری کے مدارج قائم کئے ہیں۔ ہر ملازم
 کو اس کا پورا احساس ہونا چاہئے۔ مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ انسان
 صیغہ نوکری میں داخل ہونے کے بعد تمام ایسے صفات سے مستثنیٰ
 ہو گیا ہے جو عزت نفس کے لئے لازم ہیں۔ جوزف صاحب کا مارکھا کر
 بھی راضی برضا رہنا، اور ملازمت کو صیغہ دانائیت کے احترام پر ترجیح
 دینا حد درجہ افسوسناک واقعہ ہے

مسٹر انڈرسن نے منڈی آنے سے قبل
 مسٹر انڈرسن کی سختی کا جتنا سے ایک تاریخ نام اس مضمون
 کا بھیجا کہ :-

میں آ رہا ہوں بنگلہ صاف کرایا جائے؟
 حسب الحکم بنگلہ صاف کرایا گیا۔ صاحب بہادر تشریف لائے۔ یہاں
 کے پہلے کے کلکٹر بسندہ علالت رخصت لے کر کہیں باہر تشریف لے گئے
 تھے وہ بھی جائزہ دینے کے لئے آئے۔ مسٹر انڈرسن نے جائزہ لے لیا،

۶۸
اور دفتری کام حسب معمول دستور جاری ہو گیا۔

جیسے کوتلیسا والے کمزور اور ضعیف القلب اہلکاروں سے
سابقہ پڑا تھا۔ اور وہ ان پر بے جا ظلم و تعدی اور ناجائز طرز حکمرانی
کرتے کرتے اس امر کے عادی ہو گئے تھے کہ وہ عام طور پر ہر کس نامکس
سے نہایت سختی سے پیش آئیں۔ افریقیہ کے اہلکار عموماً نیکدل اور
سیدھے سادھے ہوا کرتے ہیں اور بہت جلد رعب میں آجاتے ہیں
اور گوا کے اہلکار بھی بہت ہی نرم دل اور تحمل مزاج ہوتے ہیں۔ گو
یہ لوگ شراب نوشی کے بہت عادی ہوتے ہیں۔ اور لٹنہ کی حالت
میں بیہودہ بکینے لگتے ہیں۔ مگر اس حد تک حدود ہوش سے
متجاوز نہیں ہوتے کہ آپس میں زد و کوب پر اتر آئیں جیسے ہمارے
ہندوستان میں اکثر شاہدے میں آتا رہتا ہے پھر چونکہ یہ لوگ علم سے
عموماً گورے ہوتے ہیں اس لئے ان میں یہ جو صلہ نہیں ہوتا کہ سخت
عہدہ داروں کو جواب دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ حکام مقتدر
گوا کے باشندوں کو اپنی ماتحتی کے لئے زیادہ پسند کرتے تھے اور ان کو
ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرتے تھے۔

مسٹر انڈرسن جن کی عادت پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی۔ میرے
ساتھ بھی بد مزاجی کے ساتھ پیش آنا چاہتے تھے۔ اور اس غلط فہمی میں
بتلا تھے کہ جس طریقہ افریقیہ اور گوا کے رہنے والے اہلکاروں کے

ساتھ وہ ناجائز طور سے پیش آتے تھے اور جیسے وہ ہر ایک کو بلیڈی فول“ کہنے کے عادی تھے۔ مجھے بھی کہنا چاہتے تھے مگر میرے پاس ان کے اس نامہذب کلمے کا جواب پہلے ہی سے تیار تھا وہ یہ کہ ”یو بلیڈی فول“

مجھے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے تین چار یوم گزر گئے مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی کہ وہ مجھے نامہذب کلمات سے خطاب کرنے اور مجھے بھی ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ کڑوے جواب دینے کی ضرورت پیش آتی۔

نشل

چوتھے روز اتفاقاً پلادا ”سمر“ نہ کہنے کا جرم اور اسکی منرا بگمشتر صاحب منڈی تشریف لائے۔ اور انڈرسن صاحب کے بنگلے ہی میں فردکش ہوئے افریقہ اور یوگنڈہ اسٹیٹ کے دفاتر کے اوقات ۸ تا ۱۲ ساعت اور ۲ تا ۴ ساعت تھے۔ مسٹر انڈرسن تقریباً ایک بجے کوچ کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے بیچ کو جانے سے قبل مجھے اپنے آفس میں طلب کیا۔

میں حسب احکم حاضر ہوا اور اُن کی مینر کے دلچسپ مکالمہ سامنے کھڑا ہو گیا۔ صاحب بہادر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ غیض و غضب کی چنگاریاں اُن کی آنکھوں سے نکل رہی تھیں مجھے نہایت ہی غصے کی اداسے دیکھا اور آپ

اردلی کو حکم دیا کہ بید لائے۔ بید لایا گیا صاحب بہادر نے وہ بید ایک خاص ادائے غور، سے سامنے کی میز پر تپڑھا کر رکھا اور نہایت کرخت اور مرعوب کن لہجے میں چیخ کر مجھ سے دریافت کیا۔

”مجھے خطاب کرتے یا میری کسی بات کا جواب دیتے وقت تم ”سر“ کا لفظ کیوں استعمال نہیں کرتے۔

انشاء گفتگو میں ”سر“ کا لفظ استعمال کرنا یا نہ کرنا محض میرے میں اختیار تمیزی پر منحصر ہے۔ میں قانوناً ہرگز اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور نہیں ہوں۔“

میرا یہ معقول جواب صاحب بہادر کو بہت برا معلوم ہوا۔ وہ اس جواب کو کسی ماتحت سے کبھی امید نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ انتہائی غصے کی حالت میں چلا کر اور میز پر زور زور سے بید ٹپک ٹپک کر کہنے لگے۔

”وہ تم کو مجھ سے گفتگو کرتے وقت ”سر“ کا لفظ استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ یہ میرا آرڈر ہے۔ میں نے دیکھا کہ صاحب بہادر، ایک ماتحت ہندوستانی سے خطاب کرتے وقت اپنے کو انسائنت کی سطح سے بہت اونچا، اور اس کو بہت ہی پست محسوس فرما رہے ہیں ان کی اس بددماغی نے میرے رگ خود داری پر نشتر کا کام کیا، میں نے یہ دیکھ کر کہ وہ بار بار بید کو ٹول رہے ہیں اور اس کا انڈیکس

کہ کہیں وہ غیض کی حالت میں مجھ پر حملہ نہ کر بیٹھیں تو میں نے بھی سنے کی میز پر رکھے ہوئے رول کو اٹھالیا۔ اور رول کو اپنے ہاتھ میں لیکر تولنا شروع کیا۔ صاحب بہادر کی اس گفتگو سے مجھے بھی آپے سے باہر کر دیا تھا۔ میں اس کا تہیہ کر چکا تھا کہ اگر صاحب بہادر نے مجھ پر بید چلانے کی کوشش کی تو میرے لئے ضروری ہو جائے گا کہ میں اُن کی اس کوشش کا کامیاب ہونے سے پہلے اُن کی رول سے خاطر خا ت واضح کر دوں۔ افسری اور ماتحتی کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ افسر حدود انسانیت و تہذیب سے باہر ہو جائے اور وہ اپنے ماتحت کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھے۔

جب صاحب بہادر نے میرے یہ تیور دیکھے تو انہوں نے اس میں مصلحت دیکھی کہ وہ اپنے اس انسانیت سوز سلوک میں فوراً تغیر پیدا کریں۔

الغرض میرے ہاتھ میں رول کو دیکھ کر صاحب بہادر فوراً تھنڈے پڑ گئے، اُن کی آواز بھی مدہم ہو گئی اور چہرے کی سرخی زردی میں بدل گئی اور فرمانے لگے۔

تم میرے لئے ”سر“ (Sir) کا لفظ استعمال کرنے سے انکار کرتے ہو۔ اس لئے میرے بنگلہ پر آؤ۔ میں تمہاری شکایت پر وائشل کٹر صاحب سے کروں گا۔

میں آپ کے بنگلہ پر آنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ یہ کام دفتر یا

میرے فرائض سے مطلق متعلق نہیں ہے۔^{۷۲}

صاحب بہادر اگر تم نہیں آئے تو پروانٹل کمشنر صاحب تم کو خود طلب کر لیں گے۔

اس کی فکر آپ کو کیوں ہے۔ ہا جب پروانٹل کمشنر صاحب میں مجھے طلب کریں گے تو میں خود غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

صاحب بہادر یہ جواب سن کر بالکل خاموش ہو گئے۔ اور پنج کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے وقت دفتر میں خود صاحب بہادر ہی نہیں تشریف لائے۔ اور نہ پروانٹل کمشنر صاحب ہی نے مجھے بلایا۔

دوسرے روز جب میں دفتر گیا، صاحب بہادر بدل گئے تو صاحب بہادر، بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اور میری کل کی گفتگو کے جو نتائج نکلنا چاہئے تھا گویا وہ سب نکلے ہوئے تھے۔ آج صاحب بہادر بالکل ٹھیک، اور ان کے طرز عمل میں انسانیت و شرافت کی جھلک نمایاں تھی، انہوں نے اب جب کسی ضرورت سے مجھے یاد فرمایا، ”سٹر ساولے“ کہہ کر مخاطب کیا۔ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو میں نے بھی اپنے طرز عمل میں مناسب تبدیلی کر دی۔ کیونکہ میرا مقصد نہ تو شرافت تھا اور نہ گستاخی بلکہ صاحب بہادر کو صرف اس قدر جتنا مقصود تھا کہ

کہ ماتحت اہلکار بھی خودداری کے جذبات سے محروم نہیں ہونا۔ اُس کی رگوں میں دوڑنے والا شریف خون، ملازم ہوتے ہی خشک نہیں ہو جاتا۔ وہ بھی عزت رکھتا ہے۔ اگر اُس کی عزت کی گئی تو وہ بہترین عزت کرنے والا ہوتا ہے اور اگر اُسے ذلیل کیا گیا تو وہ مجبور ہے کہ اپنی عزت بچانے کے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کر گزرے۔ اپنے کو ذلیل کر کے شکم پُری کرنا بشری شرافت کے قطعی منافی ہے۔ ہمارے پیارے ہندوستان کے محب وطن و محبوب قوم شاعر علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اے طائر لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اب جب وہ مجھے مٹھ سا دلے کہہ کر نہایت ہی نرم و شیرین لہجے میں مخاطب کرتے تو میں بھی (Yessir) ”یس سر“ کے الفاظ میں اُنکو جواب دینے میں خوشی محسوس کرتا

اس واقعہ کے بعد تدریجاً ”مٹھ انڈرسن“ میں غیر معمولی انسانیت نرم دلی اور شفقت کے خصائص پیدا ہونے لگے یہاں تک تھوڑے ہی زمانے میں وہ میرے بڑے دوست ہو گئے اور میرے دل میں بھی اُن کی عزت و احترام کے چراغ روشن ہونے لگے۔ اب تو یہ ہو گیا کہ وہ میرے بڑے ہمدرد اور مخلص بن گئے اور میں بھی ان کا ایک اطاعت گزار، ماتحت بن گیا۔ انہوں نے باصرار مجھے

مجبور کیا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقے میں ہزار پانچ سو ایکڑ زمین مفت پیٹھ پر لے لوں جو میرے لئے بجد نفع بخش ثابت ہوگی۔ مگر میں نے انکار ہی کیا۔ کیونکہ وہاں زمین لینے کے معنی یہ تھے کہ میں پھر ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو جاتا اگر میں وہیں بود باش اختیار کرنے کا عزم رکھتا تو اتنی زمین پیٹھ پر لینے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ وہ مجھے مفت دے رہے تھے مگر میں نے اپنے کو اُس سرزمین کا پابند کرنا نہیں چاہا۔ بس میں میرے ہی روح کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔

ہاتھی کا شکار

ضلع مسنڈی ہاتھی کے شکار کے لئے ایک اہم اور معروف مقام تھا۔ بڑے بڑے شکاری مختلف اطراف سے یہاں آتے اور شکار کرتے۔ یہاں جو کلکڑ آتا وہ علاوہ سرکاری پیش قرار مشاہرے کے اس طرح بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کرتا کہ ہاتھی کے شکار کرتا اور ان کے دانتوں کو فروخت کراتا مگر یہ سہولت صرف انگریز آفیسروں کو حاصل تھی۔ کیونکہ انھیں پندرہ روزہ اجازت نامہ تیس روپیہ فیس ادا کرنے کے بعد مل جاتا تھا۔ جو

دو ہاتھیوں کا شکار کر سکتا تھا۔ لیکن ہندوستانیوں کو یہ سہولت اور مراعات حاصل نہ تھیں۔ میں کسی زمانے میں جب ایک ہندی ریاست میں تھا تو دیوالی کے موقع پر لوہے کی ٹیلوں میں بارود بھر کر ان کو توپ کی طرح چھوڑتا تھا۔ چونکہ یہ ایک ریاست تھی اس لئے اتنا بھی کر لیتے تھے ورنہ انگریزی علاقے میں شاید ایسا نہ کر سکتے۔ چونکہ میں بچپن میں ایسے کھیل کھیلنے کا عادی تھا اس لئے اور لوگوں کی طرح بندوق میرے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی۔

جب میں یوگانڈا آیا تھا تو میں نے پرندوں کے شکار کے لئے بارہ بور کی ایک بندوق خریدی تھی۔ جو بڑے جانوروں کے شکار میں کام نہیں دیتی تھی۔ بڑے جانوروں کے شکار کے لئے دوسری قسم کی بندوقیں کارآمد ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل عرض کی جائے گی۔

سیمویل بیگر۔ سپک اور شانلی جیسے ممتاز و مشہور

کالی بارود سیاح اور محقق لوگوں کی تعینات کے مطالعہ کرنے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان غیر معمولی ماہر شکاریوں کو بھی ہاتھی کے شکار میں سید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بندوق کے کارتوسوں میں کالی بارود استعمال کی جاتی تھی۔ اس بارود کا عمل یہ تھا کہ وہ گولی میں قوت، شدت، اور سرعت پیدا کرے مگر جو مقدار بندوق کے

اندر کھپائی جا سکتی تھی وہ ایک ہاتھی کو مارنے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اور اگر زیادہ بارود بھردی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بندوق کی نالی پھٹ کر خود شکاری کو شکار کر لیتی تھی۔ ان پچیدگیوں کی وجہ سے ہاتھی کا شکار سجد مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قسم کے بندوقوں اور کالی بارود سے شکار کے کامیابی حاصل کرنے والے کسی طرح اس باہمت شکاری سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے جو تلوار سے روبرو شیر کا مقابلہ کر کے شیر کو مار گراتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسا ہونے لگا کہ لوگ ہاتھی کے شکار کے لئے بڑی بندوقیں بنوا کر شکار کرنے لگے مگر کالی بارود کے استعمال سے شکار ہمیشہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ کیونکہ خونخوار بڑے جانوروں کے شکار میں ہمیشہ اس امر کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ پہلی گولی ہی ایسی کارگر ہو کہ اسی میں شکار ختم ہو جائے یا کم از کم اس بری طرح زخمی ہو جائے کہ وہ شکار کرنے والے پر حملہ کی جرات نہ کر سکے۔ کالی بارود سے یہ دونوں باتیں کا حقیقہ نہیں پوری ہو سکتی تھیں۔ بلکہ اس میں اس ناقابل تلافی خرابی اور تھی وہ یہ کہ اس سے اس قدر زیادہ اور سیاہ دھواں پھیل جاتا تھا کہ شکار کرنے والا یہ اندازہ لگانے میں سجد دشواری محسوس کرتا تھا کہ آیا اس کی گولی جانور کو لگی ہے یا نہیں؟

گزشتہ صدی کے آخر میں کارڈائٹ بارود
کارڈائٹ بارود کی ایجاد ہوئی۔ یہ تھان خرابیوں سے مترا

تھی جو کالی بارود میں پائی جاتی تھیں۔ خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں دھواں نہیں ہوتا اور کالی بارود سے کہیں زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ جب سے اس بارود کے رائفل شکاریوں کے ہاتھ آئے۔ ہاتھی گینڈا، شیر، جگلی، ہینسا اور دیگر جسیم اور خونخوار جانوروں کے شکار کی مشکلات بہت کم ہو گئیں۔

تیس گرین کارڈوائٹ بارود کے وہ کارتوس جو عام طور پر سپاہیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ ۲۰ تا ۲۵ گز کے فاصلے سے ہاتھی کی چھاتی کو اچھی طرح مجروح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

مختلف شکاریوں کے شکار کے سلیقے مختلف ہوا سلیقہ شکار کرتے ہیں۔ بعض شکاری ۳۰ تا ۴۰ گرین کارڈوائٹ کی چھوٹے منہ والی ہلکی بندوق شکار کے لئے پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اس سے کامیابی کے ساتھ شکار کرتے ہیں۔ لیکن محتاط قسم کے شکاری۔ ۴۵۰۔ ۵۰۰۔ ۵۷۷۔ بلکہ بعض اوقات ۶۰۰ بور کے یعنی ۷۰ تا ۱۲۰ گرین کارڈوائٹ کے کارتوس چھوڑنے والی بندوق کا استعمال زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی بندوقوں کے نشانے ناکام یا کم اثر ثابت ہوتے ہیں۔

چھوٹے رائفل میں بیک وقت ۵ سے ۱۰ تک کارتوس بھرنے کے لئے میگنیزین ہو کرتا ہے۔ جس سے شکاری کو ایک گونہ بڑی سہولت رہتی ہے۔ برخلاف اس کے بڑے بور کے رائفل میں صرف ایک ضربی

ہوا کرتے ہیں۔

بڑی بندوق اگر یک ضربی ہو تو کھڑے ہو کر باسانی نشانہ لگایا جاسکتا ہے اور اگر دو ضربی ہو تو ہٹیکر نشانہ لگانے میں سہولت ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ شکار کے موقع پر ہمیشہ ہٹیکر نشانہ لگانے کی نوبت آئے۔ کیونکہ اکثر ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نشانہ لگانا عمل و مقام کے لحاظ سے ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً جب شکار کا تعاقب کیا جا رہا ہو تو اس موقع پر ہٹینے اور ہٹیکر نشانہ لگانے کی نوبت کب میرا سکتی ہے بعض اوقات اسی میں سہولت اور کامیابی ہوا کرتی ہے کہ ساتھی کے کاندھے پر بندوق کی نالی کو رکھ کر نشانہ لگایا جائے۔

منڈی کے علاقے میں کوئی شخص شکار شکار کا اجازت نامہ کرنے کا قانوناً مجاز نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ وہ باقاعدہ سرکاری اجازت نامہ حاصل کر لے۔ مجھے شکار کا شوق نہیں بلکہ جنون سا ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے حسب قواعد سات سو پچاس (۷۵۰) روپیہ داخل کر کے ایک سال کے لئے اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ اس اجازت نامہ کی رو سے میں سال بھر اس علاقے میں قانون کے نامزد کردہ اور مشروط جانوروں کا شکار کر سکتا تھا۔

اجازت نامہ میں شکار کئے جانے والے جانوروں کی تعداد

اور اُن کی نوعیت درج ہوتی ہے۔ میرے اجازت نامہ میں دو ہاتھی بھی شامل تھے۔ ہاتھی سے مراد ایسے ہاتھی تھے۔ (۱) جو مادہ نہ ہوں نہ ہوں (۲) ایسے ہاتھی جن کے ہر دانت کم از کم تین پونڈ وزنی ہوں یا اس سے بھی زیادہ معمر ہوں تھیں یا تیس پونڈ سے کم وزن دانت کے ہاتھی کا شکار کرنا قانوناً بہت بڑا جرم تھا۔ جس کی پاداش میں ہاتھی دانت کی ضبطی۔ ہزار روپیہ جرمانہ یا چھ ماہ کی قید یا مشقت یا دونوں سزائیں ساتھ ساتھ دی جاتی تھیں۔

حصول اجازت نامہ کچھ روز بعد مجھے یہ ہاتھی کے شکار کیلئے خبر ملی کہ گاؤں سے دس پانچ میل کے فاصلے پر ہاتھی آئے ہوئے ہیں پھر اُس کے چند دنوں کے بعد یہ اطلاع ملی کہ آج ہاتھی باکل ہی قریب صرف تین چار میل کے فاصلے پر آگئے ہیں۔ اس وقت میرے ذوق و شوق کا عالم نہ پوچھیے۔ دل مارے خوشی کے بلہوں اچھل رہا تھا۔ لیکن ایک اہم مسئلہ سامنے تھا کہ میری ذاتی بندوق پرندوں کے شکار کے قابل تھی۔ اُس سے ہاتھی کا شکار کیونکر ممکن ہے۔ مگر یہ مشکل اس طرح حل ہوگئی۔ کہ میرے قبضہ میں پولیس کی ۲۵ سرکاری بندوقین تھیں میں نے اپنے دل میں کہا کہ مردوست انھیں بندوقوں سے کام چلاؤں گا میں نے دو آدمیوں کو پولیس کے بندوقین دے کر پہلے روانہ

کر دیا۔ اور میں سہ پہر کو تنہا سائیکل پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ میرا دل اس وقت تک ہاتھی سے مطلق مرعوب نہ تھا کیونکہ میں اپنے بچپن میں بزمانہ قیام بڑودہ کئی بار ہاتھی پر بیٹھ چکا تھا۔ اور یہ سمجھتا کہ ہاتھی بالکل بے ضرر جانور ہے یہ خیال اس وقت تک میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

میں نے گھر سے نکلنے وقت یہ عزم مصمم کر لیا تھا کہ خواہ کیسا ہی ہاتھی کیوں نہ ملے میں ضرور شکار کروں گا۔ میں اُس مقام پر پہنچا جہاں ہاتھی بتائے گئے تھے۔ یہاں مجھ اور دوسرے ساتھی میرے منتظر ہی تھے۔ میں سائیکل سے اُترا اور جگر کی رہنمائی میں گھنے جنگل میں گھسا۔ جو درختوں اور گھاسوں کی کثرت کے سبب سید گنجان تھا، اس جنگل کے درخت تو درخت معمولی گھاس کی بلندی بھی آدمی کے قد سے دو گنی تھی۔ چونکہ ادھر سے ہاتھیوں کا گزر مہور ہا تھا اس لئے اس گنجان قطع میں اُن کے چلنے سے ایک راستہ بن گیا تھا۔ ہاتھیوں کے بنائے راستے سے شکاری بھی گزرا کرتے تھے۔ میں بھی انہی راہوں پر جگر کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ آج اتفاقاً پہلے ہی سے میرا مزاج ناساز تھا دوسرے علاوہ کچھ ملیر بانی بجا رہی تھا جو اُسی علاقے میں دباے عام کی طرح پھیدا ہوا تھا۔ لیکن اشتیاق شکار میں نے ناسازی طبع کی مطلق پروا نہ کی۔ میں پیچھے متواتر چلتا رہا۔ چلتا ہی رہا یہاں تک کہ میں چلتے چلتے ٹھک گیا۔ اگسا گیا اب مجھ پر درہم سر

۸۱
 اور سبزار کی تکلیف نے بھی غلبہ پانا شروع کیا۔ اول میں کہتا تھا
 کہ کاش ہاتھی جلد دکھائی دیں۔ کاش شکار سے جلد فارغ ہو کر
 مکان واپس چلیں۔ اس دوران میں مخبر جو مجھ سے چند قدم
 آگے تھا رکا اور اُس نے اپنا دامنا ہاتھ اٹھا کر ایک جانب اشارہ
 کیا کہ وہ دیکھئے ہاتھی ہے۔ میں یہ سنتے ہی ٹھہرا اور سردار
 رنٹی شکار کے ہاتھ سے بندوق لے کر اُس کے بتا ہونے پر غور
 سے دیکھنے لگا مگر جنگل اس قدر گنجاں اور گھنا تھا کہ مجھے کچھ نہ
 دکھائی دیا۔

رتبر پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے
 ہولیا۔ ذرا دور چل کر اُس نے اشارہ سے بتایا وہ دیکھئے ایک چھوڑ
 دو ہاتھی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ کوئی ۵ پچاس گز کے فاصلے پر
 گھاس کے گیتے جنگل میں دیکھا کہ دو بہت بڑے بڑے ہاتھیوں
 کے سر نظر آ رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہاتھی نہایت آہستہ آہستہ
 چل رہے ہیں اور گھاس کی بالائی سطح پر صرف ان کے سر نظر آ رہے
 ہیں باقی تمام جسم گھاس اور درختوں کے گنجاں جو جم میں چھپا
 ہوا ہے پھر جب وہ ہاتھی کچھ اور آگے بڑھ تو ایک جگہ جہاں کچھ
 ذرا سی جگہ کھلی ہوئی تھی ان کے سراور نمایاں ہوئے بلکہ ان کے
 دانت بھی دکھائی دینے لگے۔ اس وقت میرے ساتھیوں نے مجھے کہا
 کہ یہ موفتہ اچھا ہے جلد تازہ جاکر گولی چلائے۔

میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھیوں کے متعلق اب تک جو میرا تصور تھا وہ غلط تھا۔ جو ہنی میری نظر ہاتھیوں کے بڑے بڑے سروں پر پڑی تو گویا یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں جو ہاتھی میں نے دیکھے تھے۔ ان سے یہ بالکل مختلف ہیں۔ یہ بہت عجیب انتہائی دہشت آفریں دکھائی دیتے تھے۔ اب مجھ میں بندوق اٹھانے۔ نشانہ جمانے اور گولی چلانے کا وہ جو عملہ باقی نہ تھا جو ان ہاتھیوں کے دیکھنے سے قبل تھا۔ میں بالکل سست اور مدہم پڑ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات تیزی سے دوڑنے لگے۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میری معمولی بندوق کی گولی ان کو ہتھیروں پر کیا اثر کریگی۔ میرا گولی چلانا ہرگز مصلحت نہیں۔ کیونکہ یہ گولی تو ان کے لئے ایک مکھی کے برابر حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں گولی چلا کر ان کو چونکا کر دینا ہے۔ اور ان کو اپنا دشمن بنا لینا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری گولی سے مرتے تو نہیں۔ پھر سو اس کے کچھ حاصل نہیں کہ گولی کی آواز سنکر یہ اپنے رنج کو بدلنا کر چھوے دیکھیں گے اور الٹا حملہ کر کے مجھے ہلاک کر ڈالیں گے۔ غرض میں یہ اور ایسی قسم کے خیالات کی تیز رو لہریں تھیں جو مجھے بعد دیگرے میری سطح دماغ پر گزر رہی تھیں۔ اسی حال میں ہاتھیوں کے دو دونوں سر جو دکھائی دے رہے تھے۔ میری نگاہ سے اوچل

۸۲
 ہو گئے اور اُس گنجان جنگل میں پوشیدہ ہو گئے اب مجھ میں
 اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں ان کا تعاقب کرتا۔ آخر کار
 میں نے بدوق ملازم کو دی اور خود سائیکل پر بٹھیکر جس طرح
 خالی ہاتھ گھر سے گیا تھا ویسے ہی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ یہ میری
 زندگی کے پہلے شکار کی مضمکہ خیز سرگزشت ہے۔

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد پھر مجھے
 ایک ہفتہ کے بعد دوسرا شکار۔ اطلاع ملی کہ بہت سے ہاتھی
 آئے ہوئے ہیں چنانچہ میں نشانہ دارہ مقام پر پہنچا۔ یہ کھلا ہوا
 نہایت وسیع میدان تھا واقعی یہاں بہت سے ہاتھی تھے جو صاف
 نظر آ رہے تھے۔ ہاتھی کے شکار میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ
 رکھنا پڑتا ہے کہ ہاتھی یہ محسوس نہ کر سکے کہ کوئی شکاری اُس کی
 تلاش میں آیا ہوا ہے۔ اُس کی تدبیر یہ ہے کہ شکاری ایسے رُنج
 سے کھڑا ہو کہ ہوا کی موجیں اُس کی بو ہاتھی تک نہ پہنچا سکیں۔
 کیونکہ ہاتھی کی توت شائقہ بہت تیز ہوتی ہے اور وہ آدمی کی
 بو بہت جلد پالیا کرتا ہے۔ ہاتھی شکاری کی بو پاتے ہی یا تو فرار
 ہو جاتا ہے یا اگر وہ پہلے سے کبھی کا چوٹ کھا یا بولے تو ایسا
 شکاری کی گھات میں ہو جاتا ہے اور موقع پا کر اس کو ٹکڑے
 ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔

اس وقت حسن اتفاق سے ہوا کا رخ ہماری ہاتھیوں کا تماشا مخالف جانب تھا۔ اس لئے ہماری آمد کی خبر ہاتھیوں کو نہ ہو سکی۔ میں درختوں کی گہچان قطاروں میں چھپ گیا اور نہایت اطمینان سے ہاتھیوں کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس وقت بڑے مزے کا تماشا تھا۔ کچھ ہانپتی ایک خاص انداز سے بڑے بڑے گرانڈیل درختوں کی مضبوط شاخوں کو سونڈ سے توڑ کر ان کی نرم کونپلیں کھا رہے تھے۔ ان درختوں میں بول کے درخت بھی تھے جن کی خاردار شاخوں کو نہایت رغبت سے تناول کر رہے تھے۔ کچھ ہانپتی قد آدم سے دو چند بلند درختوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ کر سونڈ میں لئے ہوئے ادراد ہر گشت کر رہے تھے۔ اگر کوئی بہت ہی بڑا اور مضبوط درخت ہوتا تو دو یا دو سے زیادہ ہاتھی متفق ہو کر اسے دانتوں سے پکڑتے اور سر کی ٹکر دے کر جڑ سے اکھاڑ کر دور پھینک دیتے اور پھر ان کی نرم و نازک کونپلیں کو جھوم جھوم کر کھاتے۔ جنگل میں جا بجا بڑے بڑے تناور درخت گرے ہوئے نظر آتے جن کو ہاتھیوں نے کونپلیں کھانے کے لئے گرایا تھا۔

یہ جھنڈ ۴۵۔ ۳ ہاتھیوں کا تھا مگر اتفاق سے ان میں کوئی بڑے دانتوں کا ہاتھی نظر نہ آیا۔ اس لئے میں حسب قواعد شکار، بندوق چلانے کا مجاز نہ تھا۔

مجبوراً شکست سے باز رہا۔

آج گو متعدد ہاتھی بالکل بنگاہ کے سامنے تھے اور میں اپنی آنکھوں سے اُن کے دلیرانہ اور بے جگرانہ کرتب دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی میرے دل پر اُن کا رعب اُس شدت سے طاری نہیں ہوا جیسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

سنڈی میں ایک نہایت ہی بھالے سے ہاتھی کا شکار اور غریب اور پریشان شخص تھا اُس کی وردناک سزا جس کے خاندان کے تمام افراد چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو کر کچے تو فریش تھے اور کچھ مر چکے تھے یہ بیچارہ اپنی تنہائی و مفلسی کے باوجود ان صدمات کا مقابلہ کرتا تھا۔ اُس کے اور کہنے کے لوگوں کے گزارے کا انحصار صرف ایک چھوٹے سے کھیت پر تھا اسی عالم پریشانی میں ایک شریر اور موزی ہاتھی روزانہ رات کو اُس کے محنت سے تیار کئے ہوئے کھیت میں گھس آیا کرتا اور اُسے اجاڑا کرتا۔ یہ بیچارہ سخت تنگ آ گیا تھا ایک دن اُس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ مرنا یوں بھی ہے، اور یوں بھی۔ اس سنگ دل ہاتھی کو کسی طبع ختم کرنا چاہیے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہاتھی کو مار کر اُس کی آئے دن کی شرارتوں سے نجات حاصل کر لیں گے اور یا خود میں ہی مار ڈالا جاؤں گا۔ غرض دونوں صورتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں غم و فکر سے نجات پا جاؤں گا۔

جب آدمی حد سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے تو آخر کار اپنی جان پر کھیل جانا تک آسان سمجھ لیتا ہے۔ اس شخص کا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ وہ ایک رات اپنے گھر سے ایک بھالا لیکر چلا۔ اور موزکے درختوں کے اندر اسی چور ہاتھی کی گھات میں بیٹھا۔ حسب معمول ہاتھی آیا۔ اس کے کھیت میں گہسا۔ یہ شخص بھی پوری ہمت سے پیچھے گیا۔ اور بلا کی تیزی سے اس نے وہ بھالا اس ہاتھی کی پسلی میں یکا یک بھونک دیا۔ بھالا بھی بہت ہی تیز تھا۔ پسلیوں سے گزرتا ہوا اس کے کلبجے تک پہنچ گیا۔ ہاتھی اسنا گہانی ضرب کی تاب نہ لاسکا تورا کر اٹھا اور چیختا ہوا بھاگا کہ دو سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر بیدم ہو کر گرا۔ اور وہیں فوراً مر گیا۔

اس پریشان حال زندگی سے بیزار و غریب عدالت کی بواجبی و مفلس کو حکومت کے کارندوں نے اس جرم میں کہ ہاتھی کو کیوں مارا گرفتار کر لیا۔ اور مجرم کے کٹھڑے میں کھڑا کر کے اس کو ایک ماہ قید کی سزا دی گئی۔

اگر اس قسم کی بہادری اور دلیری کا کام کسی متمول شخص سے ہوا ہوتا تو اسے بیش قرار انعام دیا جاتا۔ اخبارات و رسائل میں اس کے فوٹو شائع کئے جاتے اور اس کے اعزاز و اکرام میں عطر نے اور عشاء نے ترتیب دیئے جاتے۔ مگر چونکہ یہ غریب ایک سناہ نام محکوم تھا

لہذا اُسے مزاد دی گئی۔ سچ ہے زبردست مارے اور رونے نہ دے
اور علامی کی پاداش کتنی المناک ہوتی ہے!

علامی کا مقام حاکموں کی نگاہ میں کیا مرتبہ، و مقام، اور
وہ ان کو کس دائرے میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا مزید اندازہ ذیل
کے واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

یوگانڈہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ ہر کلکٹر ضلع اپنے علاقے کے
تظم و نسق کی ماہانہ رپورٹ کمشنر کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ جس میں
پورے ماہ کے اُس علاقے سے متعلق حالات و رجحانات اور واقعات
تفصیلاً درج ہوا کرتے تھے۔

اسی طرح ایک ضلع کے کلکٹر نے ایک ماہ کی رپورٹ کمشنر کو روانہ
کی جس میں درج تھا کہ بادشاہ سلامت کی سالگرہ کے روز یہاں ایک
عظیم الشان جلسہ مرتب و دعا گوئی منایا گیا جس میں مقامی لوگوں نے بھلے
مارنے تیر چلانے وغیرہ کے کرتب اور بہادری کے لائق نمائش دکھائے
اس وقت مسٹر ہسکٹ بل (Mr. Hasket Bil) یوگانڈا
کے کمشنر (اب کمشنری گورنری سے بدل گئی ہے)۔ انھوں نے رپورٹ
پر تحسیر فرمایا کہ اس قسم کی کوئی ترغیب (جس سے رعایا میں بہادری
اور بے خوفی کے جوہر پیدا ہوں) ہرگز نہ دینی چاہیے۔ اور اس تجویز
کی اطلاع جملہ کلکٹروں کو بذریعہ گمشدگی کر دی گئی۔

جسٹس بل کا یہ فرمان اور پھراس کی تمام اضلاع میں مضابطہ
 اُس نیک نیتی اور رفاہ خواہی کا بھانڈا پھوڑتی ہے جو اپنی رعایا
 کے باب میں مفید کام آفادوں کے دلوں میں تھوڑا سا طرح ہندوستان میں قانون سلو
 کا نفاذ اور اُس پرستی سے پابندی کی یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ
 حکومت اپنی رعایا کو کیا بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اور ان میں بزدلی
 اور نامردی اور پر خونی کے جرائم کی پیدائش اور ان کی پرورش
 کے لئے کیا کچھ انتظام ملحوظ رکھتی ہے۔ آج انگریزوں کو ایک صدی
 سے زیادہ زمانہ حکومت کرتے ہوئے گزر گیا۔ مگر اس اتنی طویل
 مدت میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ فرماں روائی یہ ہے کہ
 ہندوستانی باشندے اپنے ملک اپنے وطن، اپنے مذہب اور
 اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے۔
 حکومت کی جاؤگری نے اہل ہند کے دماغ سے احساس غریب
 و خودداری کو اس حد تک فنا کر دیا ہے۔ کہ آج انھیں دنیا کی
 زندہ اقوام کی صف میں کہیں جگہ نہیں مل سکتی۔ ایک فرض
 شناس حکومت اپنی رعایا میں اچھے اوصاف پیدا کر کے انہیں
 بشریت کا اعلیٰ درجہ دینا چاہتی ہے مگر جس حکومت کا مقصد یہ ہو
 کہ صرف اپنی قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔ وہ حکومت کبھی یہ چیلرا
 نہ کرے گی کہ اس کی نیت میں بھی انسانیت کے اعلیٰ جوہر اور غیرت و جرات
 کے پاکیزہ احساسات پیدا ہوں۔ ہندوستان میں تا وقتکہ قانون سلو

کو منسوخ کر کے اسلحہ کے جائز استعمال کی اصولی اجازت نہ دی جائے
ہندوستانیوں میں متعین بنے خونی ضروری بہادری اور شجاعت کے
ادصاف نہیں پیدا ہو سکتے۔

میرا پہلا کامیاب شکار۔ جاتا رہا مگر ناکام ہی لوٹتا رہا۔ میرے
پہلے کامیاب شکار کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ میں کچھ دنوں کے لئے سڑی
کی آبادی چھوڑ کر جنگل میں رہنے لگا تھا۔ فرصت کے اوقات میں
میرا یہ معمول تھا کہ ادھر ادھر ہاتھیوں کی تلاش میں نکل جاتا۔ اور ان
کا تماشہ دیکھا کرتا۔ اس طرح روز دوپہر کے وقت میں ایک گنے جنگل
میں گشت لگا رہا تھا۔ کہ نہایت جیتناک آواز سنائی دی۔ اس
آواز نے میرے قدم روک دیے۔ مگر میں ہمت کر کے ایک درخت
پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہاتھی ایک درخت
کے نیچے کھڑا ہے۔ جس کے سر کا ایک حصہ صاف دکھائی دے
رہا ہے۔ ہاتھی حصہ درختوں کے ہجوم میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے
دانت بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے یہ خیال کیا اس وقت
اگر ہاتھی پر کوئی چلاؤں تو بہت ہی مناسب ہے اول تو حین اتفاق
ہے کہ درخت پر بیٹھنے کے باوجود نشانہ لگانے میں سہولت ہے،
دوسرے خدا نہ کردہ اگر میرا نشانہ خطا بھی ہو جائے تو ہاتھی پلٹ کر
مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اس خیال نے فوراً قوت پکڑی اور میں نے وہیں

٩٠
 بیٹھے بیٹھے اوس کے سر کو تاک کر ایک گولی چلائی نٹا نہ بالکل ٹھیک
 بیٹھا اور وہ گولی ایسی گئی کے ہاتھی وہیں تلملا کر گر پڑا اور ایک قدم
 بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہاتھی میں اتنی سکت ہی نہیں رہی
 کہ وہ مجھ پر حملہ کر سکے تو میں درخت سے اتر کر نیچے آیا۔ اُس کے سر کے
 ایک حصہ سے خون جاری تھا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ گولی اس مقام
 پر لگی ہے۔ اور زیادہ غور کرتے پر معلوم ہوا کہ ابھی آنکھ کے اوپر لگی
 ہوئی دماغ کے سیدھے رخ میں گھس گئی۔ یہ مقام بہت نازک تھا
 جس نے گولی کے اثر کو بیش از بیش قبول کیا ورنہ اگر یہی گولی ذرا بچکر
 سر کی پٹری کو گھتی تو تقریباً بالکل بے اثر ہوتی اور اس کا نتیجہ بجز
 اس کے کچھ نہ نکلتا کہ ہاتھی کو چھیر کر اُسے اپنا دشمن بنا لیا جاتا۔

زندگی میں یہ پہلا ہاتھی تھا جسے میں نے
ہاتھی کے حصے بخرے شکار کیا۔ اس کا میا بی پر میرا دل اتہا
 مسرور ہوا۔ میں اپنے کیمپ کو واپس لوٹ آیا اور اس کی اطلاع لوگوں
 کو دی۔ یہ خیر آنا فانا بجلی کی طرح تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ پھر کیا تھا
 تمام گاؤں دوڑ پڑا۔ کسی کے ہاتھ میں بھالا ہے تو کسی کے پاس خنجر کسی کے
 پاس نہر ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مرے ہوئے ہاتھی کے چاروں طرف
 اچھا خاصہ ہجوم ہو گیا۔ گاؤں والوں کے لئے ایسے موقع خاص ہوا کہ
 ہیں۔ وہ اس جانور کا گوشت نہایت خوشی سے لوٹتے ہیں۔ ہاتھی کے

مختلف اعضا گھاؤں کے ممتاز عہدہ دار چودہری ٹیل یا قانون دان دیہاتی کارندوں کا حق سمجھا جاتا ہے اور باقی گوشت عام باشندے آپس میں تقسیم کرتے ہیں اور کبھی لوٹ شروع ہوتی ہے اور جس کے ہاتھ جو آجاتا ہے لیکر چلتا بنتا ہے۔

اس تماشے میں مجھے ایسے لوگ بھی نظر آئے جو نہایت بے صبری کے ساتھ ایک ہاتھ سے خنجر سے گوشت کاٹ رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ویسا ہی کچا گوشت نہایت ذوق و شوق سے کھا رہے تھے۔ سامنے ایک اونچا ڈھیر لگا ہوا تھا یہ ہاتھی کی اٹھریاں تھیں اس طرح ایک مرے ہوئے جانور کے گرد انسانوں کا ہجوم اور پھر اس طرح ان کا ہاتھی کے حصے بخرے کرنا اور بعض کا یونہی کچا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانا۔ نہاتاتی برہمنوں کے لئے جس قدر بھی ناگوار اور مکروہ منظر ہو کم ہے۔ خود میں ایسا پکا نہاتاتی (دیکھتے ہیں) نہ تھا بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اہمسا کے ماحول میں تربیت ہوئے برہمن اس منظر کو دیکھ کر سجد تکلیف محسوس کریں گے۔ مگر میں ان مناظر کو دیکھ کر کچھ دنوں میں ایسا خوگر ہو گیا تھا کہ مجھے اس میں نہ تو کچھ بیگانگی محسوس ہوتی تھی اور نہ کراہیت میرے نزدیک یہ خون میں ڈوبا ہوا منظر اتنا ہی دلچسپ تھا جیسے مہلی میں ساحل چوپاریٹی پر کھڑے ہو کر سمندر کی سیر کرنا۔

اس ہاتھی کے دانت گو بہت بڑے ہاتھی دانت کی قیمت نہ تھے مگر منڈی کے ایک تاجر نے پھر بھی دونوں دانت ۵۰ روپیہ میں خرید لئے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ میں نے یہ ہاتھی بولس والوں کی معمولی راض سے شکار کیا تھا۔ جو صرف ۳۰۰۲ پور کی تھی

میں نے اس زمانے میں دیکھا کہ یورپین شکاری یورپ میں شکاری جھیل البہرٹ اور نیل کے اُس مغربی حصے میں جا کر جو بمبیں حکومت کے تحت تھا۔ جس قدر چاہے ہاتھیوں کا شکار کرتے اور اُن کے بیش بہا دانتوں کی تجارت کر کے خاطر خواہ دولت پیدا کرتے۔

یہ علاقہ جس میں یورپین شکاری بے روک ٹوک شکار کرتے تھے اُس مقام سے شروع ہو کر جہاں دریائے نیل جھیل البہرٹ سے ملتی ہوئی مصر کی سمت جانے کے لئے بجانب شمال مڑتی ہے۔ گونڈو کورود لاڈوا نکلا، ہنگ یعنی یوگانڈا اور سوڈاں کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ نیل کے ایک مغربی جانب کے حصے کو لاڈوا نکلا

(Lado enclave) کہتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام علاقہ ایک صلحاً کے بموجب اُس وقت کے بادشاہ "کنگ لیوپالڈ (King Leopold)" کی وفات کے بعد سوڈان کو واپس کر دینا چاہے اس نے بمبیں حکومت نے تمام مورچے برخواست کر دیئے تھے۔ مگر پھر بھی انگریز "اس

سرزمین سے استفادہ کا اپنے کو حقدار سمجھتے تھے اور اسی بنا پر پانڈگس کرچوری چھپے ٹھکانے کرتے تھے۔

ہندوستان کو رانگی اور شکار کا اہتمام اسی زمانے میں مجھے ہندوستان مل گئی۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا کہ وطن بھی دیکھ آؤں گا۔ اور آئندہ کے لئے اپنے ذوق شکار کی تکیس کے سلسلے میں جس ساز و سامان کی ضرورت ہوگی اُسے بھی مہیا کر لوں گا۔

چنانچہ میں منڈی سے روانہ ہو کر پہلے بمبائے آیا یہاں میں نے تقریباً تمام ایسی اشیاء خریدیں جن کی شکار میں اور صحرائی زندگی میں ضرورت پڑا کرتی ہے۔ جیسے اچھے رائفلس۔ خیمہ۔ کمپ فوئچر وغیرہ اس انتظام کی تکیس کے بعد میں ہندوستان آیا۔ یہاں میرا تقریباً دو ماہ قیام رہا۔

پونہ کی سیر چند آٹسو چند آٹسوں میں دوران میں اپنے دیرینہ اشیاء سے مجبور ہو کر مہاراشٹر کے قدیم دار الحکومت پونہ آیا۔ میں بچپن ہی سے پونہ کی تعریفیں سناتا تھا۔ کہ وہ مرہٹوں کے جاہ و جلال کا مرکزہ چکا ہے۔ اُس کے باشندے غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور بلند اخلاقی کے حامل ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر عجرات احمد آباد، بڑدودہ اور سورت وغیرہ سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ

ایسی ہی حسن زنی تھی جس نے مجھے آمادہ کیا کہ وطن جانے سے قبل چند دنوں کے لئے پونہ میں ضرور قیام کر دوں گا۔ بمبئی پہنچ کر میری ملاقات مشہور ہومیوپیتھک ڈاکٹر واسکر سے ہو گئی۔ انہوں نے ایک خط سری بت جوشی صاحب (پونہ) کے نام دیا۔ میں بمبئی سے روانہ ہو کر شب کو آٹھ بجے پونہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ تاکہ گرا یہ پر کر کے بدھ دار پٹھ (جو اس شہر کا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے) کو روانہ ہوا۔ میرا ستاںگہ ایک ایسے راستے سے گزرنے لگا جس کے دونوں جانب پست مکانات تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، مگر مجھے تمام راستے میں ایک شاندار مکان نظر نہ آیا۔ چھوٹے چھوٹے بے رونق مکانات، جن سے افلاس و کبت نمایاں تھی۔ اور جن میں سے اکثر چھپر دالے مکانات بھی تھے جن پر گوبر کا پلاٹر معلوم ہوتا تھا مگر دراصل وہ کوہلو "چھائی موئی تھی۔ اثنائے راہ میں مجھے خیال ہوا کہ شاید میں ابھی اچھلی شہر میں نہیں پہنچا ہوں یہ شہر کے کنارے کے مکانات دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اب آگے چل کر شہر کی شاندار آبادی شروع ہوگی۔ میں اپنے خیالات میں تھا کہ چلتے چلتے یکا یک تاکہ رکا میں سمجھا کہ یوں ہی کسی ضرورت سے رگ گیا ہے مگر تاکہ والا بھی اتر پڑا اور کہنے لگا کہ حضور۔ بدھوار پٹھ بھی ہے۔

اب میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی۔

سری بت جو شفی صاحب نے اول تو اپنے ہی دولت کدے پر قیام کرنے کے لئے مجھے بہت اصرار کیا مگر درخواست پر انہوں نے ایک دوسرا الگ مکان مجھے دلا دیا جس میں میرا قیام رہا۔ دوسرے روز شہر میں گھوما۔ اس سلسلے میں ناتو کا باڑہ بھی دیکھا۔ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پونہ کے متعلق میرے جتنے خیالات پہلے سے قائم تھے وہ ایک ایک کر کے سب غلط ثابت ہوئے۔ مجھے اسی طرح یقین بھی نہیں آتا تھا کہ پونہ اتنا پست اتنا بے رونق اتنا غیر دلچسپ ہو سکتا ہے مگر اس کو کیا کروں کہ میں اس یقین پر مجبور تھا کیونکہ درحقیقت یہ شہر پونہ ہی تھا۔ مرہٹوں کی شان و شوکت کا مدفن!

میں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا

مرہٹوں کی اہمیت حالی تھا کہ تجارت و کاروبار کے ذریعہ

سے مرہٹہ قوم کی یہی سہمی پونجی بھی، گجراتی، مارواڑی، بوہرہ، جو پورہ اور بھون لوگوں کے پاس جا رہا ہے۔

مرہٹوں میں اس کا احساس ہی نہیں کہ دنیا میں باغزت زندگی

بزارنے کے لئے پیدا ہوئی ہے مگر ناچا ہے اللہ اللہ جو بیدار ہوتا ہے اس میں

مقصد حیات صرف ملازمت ہوتا ہے۔ ملازمت یعنی مہذب غلامی

مگر وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں تو وہ بھی کسی ملازمت ہی کو

تجارت، صنعت و حرفت جو آزادی رترقی کی شاہ راہیں ہیں ان پر کہیں بھول کر بھی نہیں چلئے۔ کوئی قوم جس نے ملازمت ہی کو اپنا نصب العین بنالیا ہو وہ کبھی معزز ہو سکتی ہے نہ دولت مند مرٹوں کی موجودہ پستی ان کی اپنی خیال کا نتیجہ ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مرٹوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو عہد حاضر کی اعلیٰ ترین تعلیم سے آراستہ ہوئے ہیں مگر ان کے پیش نظر بھی کوئی بلند مقصد حیات نہیں ہوتا۔ ان کے دل و دماغ پر بھی کسی اعلیٰ ملازمت کا ہی خیال مستولی رہتا ہے۔

کسی آزاد پیشہ کی طرف اگر کسی نے رغبت بھی کی تو زیادہ سے زیادہ وکالت یا ڈاکٹری مگر یہ آزاد پیشے بھی برائے نام آزاد ہیں جس کی ہتھ میں غلامی چھپی ہوئی ہے وہ کبھی وکیل یا ڈاکٹر منکر ہی اپنی قوم کی خوش حالی میں اضافے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ ان کو دنیا کی خوش نصیب قوموں کی طرح تجارت، صنعت و حرفت کی واہلوں میں نہایت مستعدی اور تیزگامی سے گرم رفتار ہونا چاہئے۔

کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ مرہٹہ قوم جس نے کسی زمانے میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنا مخصوص مقام آپ پیا کیا تھا آج اسی بستی و ذلت میں پڑی ہوئی ہے اور اسے اس کا ذرا بھی احساس نہیں کہ دنیا کی دوسری پست قومیں کس طرح بام عروج پر پہنچ کر داد حیات سے رہی ہے کیا اس کے لئے دنیا کے ان تغیرات و انقلابات میں کوئی

سبق اور کوئی بصیرت نہیں ؟

میں سرى جت جوٹى صاحب كے ساتھ اكثر دن جمنا نہ ميں ٹينس
 كھيلنے جايا كرتا تھا وہاں متوسط اور اعلا درجہ كے مرٹے بھائيوں سے
 ملنے اور تبادلہ حياالات كا موقعه حاصل ہوتا رہا۔ ميں نے یہ ميخبر نكال۔ كہ اس
 قوم ميں ابھى اور سچ مچ كى ترقى كرنى كا احساس بھى فضا ہوگيا ہے۔ ميں
 كسى كے سينے ميں بھى ترقى و عروج حاصل كرنے اور اپنى قوم كو موجود دستا
 سے نكا كرفلاح و بہبودى كى بلنديوں پر چڑھا ہوا ديكھنے كى تمنا نہيں پالى
 بل كے۔ غلامى! ايسے ملازمت !!۔

ہندوستان کا فریقہ کو واپسی ترک ملازمت

میں اپنے پروگرام کے باکل مطابق دو ماہ ہندوستان میں رہنے کے بعد پھر آفریقہ واپس ہوا۔ بسا بہ آیا یہاں کی سرکار یوگانڈہ نے مجھے مشہرتی صوبے کے مقام (Mbale) کے کلکٹریٹ میں بھیج دیا۔ میں یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں مسٹر جیکسن (JACKSON) اسٹنٹ کلکٹر ہیں جو گوانی اہلکاروں میں اپنی فطری بد اخلاقی اور بد مزاجی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان سے میرا سامنا ہوا تو انہوں نے مجھے بھی کوئی گوانی سمجھا اور مجھ سے بھی اسی طرح پیش آنا چاہا۔ مگر میری جانب سے ترکی بہ ترکی جواب پاکر حیرت زدہ رہ گئے۔ معاملہ ذرا سنگین ہو گیا تھا۔ میں

بالکل آبادہ تھا کہ اگر یہ مجھ سے اذانت سے پیش نہ آئے تو مجھے بھی انہیں ایک ایسا سبق دینا ضروری ہو جائے گا جسے شاید وہ تمام عمر بکوشش بھی نہ بھلا سکیں۔ مگر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی ذہانت سے بروقت سب کچھ سمجھ گئے اور نہایت فراست اور انجام مہنی سے کام لے کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی میرے پاس پھٹکے بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ قصداً مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میری اس کتاب کے قارئین بخوبی معلوم کر چکے ہونگے مجھے ملازمت سے قطعی نفرت تھی۔ میرا دل ملازمت میں نہ سرت محسوس کرتا تھا اور نہ اطمینان ایک مجبوری تھی جس نے مجھے میرے ضمیر، ارادہ اور خواہش کے خلاف ملازمت سے داغدار بنا دیا تھا اس مرتبہ ہندوستان سے آتے ہی۔ میرے دل کی دنیا میں یکایک ایک ایسا موثر انقلاب ہوا جس نے مجھے قطعی مجبور کر دیا کہ میں پہلی فرصت میں اپنے گلے سے ملازمت کے طوق کو نکال کر پھینک دوں۔ بعض اوقات نے مخالفت بھی کی اور کہا کہ اب تمہاری یافت ایک سو پچیس روپیہ ہے اور عنقریب تم اور ترقی کر دو گے اور ایک ہندوستانی اس حکومت میں جس قدر ترقی کر سکتا ہے وہ ترقی تمہارے سامنے ہے۔ لہذا ملازمت ترک نہ کرو۔ چند سالوں کے بعد تم پنشن کے مستحق ہو جاؤ گے لیکن اس مرتبہ ترک ملازمت کا جذبہ کچھ ایسا قوی پیدا

ہوا کہ میں اسے کسی طرح دبا نہ سکا۔ اور میں نے اپنے بھی خواہ دوستوں کی مرضی کے بالکل خلاف ملازمت سے استعفاء دے دیا۔ گو مجھے ابھی ہندوستان سے آئے ہوئے صرف ایک ماہ بھی بمشکل گزر ا تھا۔ استعفاء دینے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اب تک ایک تعفن، تاریک اور گھٹنوں نے غار میں پڑا ہوا تھا جس سے خداے مجھے نکال کر بچھ پر اپنی خاص عنایت مبذول فرمائی ہے۔

مستقل مشغلہ شکار۔!

پھر مسڈی کو۔ بہ سابق اجازت نامہ کی رو سے ابھی مجھے یہ حق حاصل تھا کہ اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور ہاتھی کا شکار کروں۔ چنانچہ میں اپنا نیا سامان شکار لے کر، مسڈی کو روانہ ہوا۔ یہاں سے نکل کر بگانگہ پہنچا جو ہندی سوداگروں کی چھوٹی سی نوآبادی ہے۔ یہاں نہ کوئی سرکاری آفیسر تھا اور نہ پولیس کا تھانہ۔ سو، اتفاق سے میں یہاں پہنچے ہی بلیک، دائرہ مرض کا زنگی میں دوسری بار شکار ہوا۔ مگر یہاں نہ کوئی معالج، نہ ڈاکٹر اور نہ علاج کا کوئی اور امکان بخت و شوری کا سامنا کرنا پڑا۔ گویا اس وقت موت میرے سامنے ناچ رہی تھی اور مجھے اشاروں سے اپنی جانب بل رہی تھی۔

ایسے وقت میں مجھے خیال آیا کہ جب کوئی

شراب کے علاج۔ دوا دستیاب ہی نہیں ہوتی تو لاؤ اسی دوا

کا پھر ایک بار کیوں نہ تجربہ کروں جس نے گزشتہ منڈی کے زمانے میں مجھے اسپریم۔ بخار سے ایسے نازک وقت میں نجات دی تھی یہ

بخار کی انتہائی شدت سے میں انتہائی مضطرب اور بدحواس ہو گیا تھا

اور میرے سینہ پر لاکھوں من کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میری سانس

رک کر جا رہی تھی اور گویا دم بھون پر اچکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس

وقت میں ایک چائے کی پیالی میں پچھلے حصہ برانڈی اور تھوڑا سا

پانی ملا کر پی لیا تھا جس سے تھوڑی دیر کے بعد یہ محسوس ہوا کہ

سینہ پر جو بھاری بوجھ ہے وہ اٹھ گیا ہے سانس نہایت سہولت

و راحت سے رواں ہو گئی اور تمام جسم پر پینہ آ کر بخار بھی اتر گیا ہے

اس گزشتہ تجربہ کی یاد نے مجھے آمادہ کیا کہ دسکی یا برانڈی

جو کچھ مل جائے اسے فوراً استعمال کر کے دیکھوں ممکن ہے کہ بلیک

وائر کا بھی شافی علاج ثابت ہو۔ بلیک وائر میں بخار شدید

ہوتا ہے اور انتہائی خطرناک کن اس کے ساتھ پیشاب کا رنگ

بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ سیاہ نازک گول کی طرح !! اور نہایت

ہلکے وزن پر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ دل

کی حرکت یک سخت بند ہو رہی ہے۔ میں نے دسکی پینی شروع کر دی۔

واقعی اس نے فائدہ پہنچایا اور تین دن میں بخار بھی کم ہو گیا اور پیشاب

بھی صاف آنے لگا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے بخارا آنے کے بعد بھی مجھے اس مقام پر ایک ہفتہ بغرض آرام رہنا پڑا۔

ایک ہفتہ کے بعد گنگانگہ سے گلگندہ پہنچا۔ یہ گاؤں نیل ندی کے

کنارے آباد تھا۔

یہاں سے کشتی پر سوار ہو کر مسولی (بندر گاہ) کو روانہ ہوا۔

دراصل دریائے نیل کا آغاز جنتا سے ہوتا ہے یہاں سے گلگندہ گاؤں

کا فاصلہ ۴۰ میل ہے یہاں یہ ندی کیا گو جھیل سے ملتی ہے۔ یہاں

پہنچ کر میں نے رات گزاری۔ مگر یہ رات جید تکلیف سے گزری۔

کیونکہ اگر میں پانی میں کشتی وغیرہ پر رہتا ہوں تو مگر مچھروں کا

خوف ہے اگر ساحل پر رہتا ہوں تو زہریلے خونے مچھرناک میں دم

کرتے ہیں جون توں رات گزاری اور پھر دن بھر سرگرم سفر رہا۔

پھر یہ رات بھی ایک جزیرہ رواں میں گزری۔ اس ندی میں کنول

اور دیگر نباتات سے ڈکے ہوئے چھوٹے چھوٹے بہت سے جزیرے

ہیں۔ میں نے شب جس جزیرے میں گزاری وہ زیادہ سے زیادہ

۵۰ فٹ مربع تھا۔ اس کی زمیں سب کی سب دلدل تھی مگر میں نے

پھر بھی خاص تدبیر سے کام لے کر آگ جلائی اور کھانا تیار کر ہی لیا

آج رات میں کشتی میں پھر دان لگا کر سویا۔ کیونکہ کنارے کہیں

ایسی جگہ نہ تھی جہاں ڈیرہ نصب کیا جاسکتا

مختصر یہ کہ اسی طرح دن بھر چلتا اور رات کو کسی چیز سے میں
بہر کرتا ہوں۔ مردکی پہنچا۔ یہاں میں نے دریائی سفر ختم کر دیا اور
براہ صبح چار یوم کی مسافت طے کر کے مسنڈی کے ایک پرگنہ میں
داخل ہوا جس کا نام چو پے تھا یہ پرگنہ ہاتھیوں کی کثرت کے
لئے مشہور تھا۔

سی لاجل - ناکامی ناکامیابی - ۶۶

مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ اس
علاقہ میں ہاتھی آنے کی اطلاع ملی۔ میں تیار ہو کر نکلا۔ جنگل میں
پہنچ کر مجھے ایک بہت بڑا ہاتھی دکھائی دیا جس کے دانت بہت
بڑے بڑے تھے۔ اتنے بڑے دانت بہت کم ہوتے ہیں۔ جس
مقام پر ہاتھی تھا وہاں درخت اور گھاس بھی کم تھی۔ میں نے
.. اگر کے فاصلے سے گولی چلائی لیکن ہاتھی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور
وہ تیزی سے دوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس کا
دور تک پیچھا کیا اور جس جس طرف دل نے شہادت دی اس کی
تلاش میں نکلا مگر ناکامی رہی۔ آخر کار میں واپس ہوا اور اپنا
کیسپ لے کر آگے روانہ ہوا۔ ۵ - ۶ روز کے بعد اطلاع ملی کہ
میں نے جس جگہ گولی چلائی تھی اس کے قریب میں ایک ہاتھی مرا
پڑا ہے میں خبر پاتے ہی چلا تو واقعی ایک ہاتھی مرا ہوا پڑا تھا

۱۰۴
 اس کا جسم سڑ گیا تھا اور تعفن سے تمام فضا ناقابلِ تحمل ہو رہی تھی۔ اب اس ہاتھی کے مارنے کے کئی مدعی نکل آئے۔ اس انتظار میں وہاں بیٹھا رہا کہ اگر گولی نکل آئے تو اسے دکھا کر دوسروں کو قابلِ کروں کہ یہ میری گولی ہے مگر گوشت کے اس بھاری انبار میں جو سڑ کر پھول بھی گیا تھا گولی کا ملنا آسان نہ تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ کاش میں نے یہاں سے واپس ہوتے ہوئے اس حصے کے رہنے والوں کو کیوں نہ اس امر کی اطلاع کر دی ہوتی کہ میں نے ایک ہاتھی پر گولی چلائی ہے اگر وہ کہیں گر پڑا مل جائے تو مجھے اطلاع کر دیں مگر میں ایسا نہیں کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اپنی کاوش کے ثمرہ سے محروم رہنا پڑا۔ مجھے اس ناکامی کا بچہ صدمہ ہوا۔ یہ ہاتھی دانت کسی طرح بھی تین چار ہزار روپیہ سے کم مالیت کے نہیں تھے میری تمام آرزوؤں پر پانی پھر گیا اب میرے لئے یہی مناسب تھا کہ صبر کر کے دوسرے شکار کی تیاری کروں کیونکہ جب وہ ہاتھی میرا مارا ہوا ایلیم ہی نہیں کیا گیا تو مجھے ایسے اجازت نامہ کی رو سے ایک ہاتھی کے شکار کرنے کا حق باقی تھا۔ میں عالم دیوانگی اور پریشانی میں بھلا تا کہ بقیہ مدت کے اندر جس طرح کبھی ممکن ہو ایک بڑے دانتوں والے ہاتھی کا شکار کر لوں۔ تاکہ آپنڈہ کے مصارف شکار کی پابجائی کر سکوں۔ ہاتھی کے شکار میں ایک تجربہ کار

رہبر کی بہر حال بچید ضرورت ہے۔ مذکورہ بالا شکاریں میرے ساتھ
کوئی ہوشیار رہبر نہ تھا ورنہ مجھے اتنے عظیم نقصان کا زخم اپنے
دل پر نہ لینا پڑتا۔

جول جول وقت گزرتا جا رہا تھا مجھے مستقبل کی نگرانی کرنے تانے
میں زیادہ بیداری سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس دوران میں
مجھے ہاتھیوں کے آنے کی اطلاعیں ملتی اور میں اکثر پدمید دل لیکر
شکار کے لئے بھی جاتا اور گرنے کا کام ہی لوثتا۔ ان مہم ناکامیوں نے
ہمت پست کرنی چاہی مگر میں نے اپنے کو بہت سہنا لا۔ اجازت نامہ
کی مدت کے اختتام کو اب صرف ایک ماہ باقی رہ گیا۔ میرے
دل کی عجیب کیفیت ہوئی یہی واقعہ ہوتے ہیں جب انسان نڈر
اور منین مانگتا ہے۔ میرے لئے گویا اس کا موقع آ گیا تھا کہ میں بھی
پنڈھر پور کے وٹھو با، یا کوٹھا پور کی رتنا بانی کہنت مانگوں۔
مگر میں ذرا اس خام اعتقادی کا بہت کم عادی ہوں۔

میں نے ایک آبجانی انگریز شکاری کے ملازم سے یہ سنا کہ
اُس کا صاحب جب شکار کے لئے جاتا تو وہ کچھ زیر زیر فلک ننگے
سر کھڑا ہو کر اپنے آسمانی باپ سے دعائیں مانگ لیا کرتا۔

میں اس کشمکش کے دن کاٹ رہا تھا کہ ایک
کامیاب شکار روز منہ اند میرے ایک شخص میرے پاس
آیا اور اُس نے ہاتھی کے آنے کی خبر دی۔ میں ابھی سوکر اٹھا تھا

فورا کپڑے پہن کر اور بندوق کے کمر چلتا بنا۔ دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے چلتے میں اُس مقام پر پہنچا جہاں ہاتھی کا پتہ بنا یا گیا تھا۔ آج میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ گویا میں عزمِ مہم کر لیا تھا کہ آج خواہ مجھے اپنی جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دہونا پڑے۔ میرے لئے لازمی ہے کہ میں بُرے دانت کے ہاتھی کا شکار کروں۔ اس وقت میرے دل سے ہاتھی کا خوف بالکل نکل چکا تھا۔ اور موت بھی میرے لئے کچھ زیادہ ہیبت و پروہشت نہیں تھی۔ یہ مقام چٹیل نہیں بلکہ لمبی لمبی گھاس کا گھنا جھل تھا۔ میں نے دیا سلائی چلائی اور اُس کے دھوئیں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگایا۔ اور درختوں کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے یہ قیاس کیا کہ اب میرے اور ہاتھی کے درمیاں ۵۰ - ۶۰ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔

میں اس اندازہ سے بندوق چلائی کہ گولی دامنی نبل میں کیلجے کے قریب گئے۔ بندوق کی آواز بھی آئی لیکن ہاتھی پر بظاہر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ دوڑ کر بچا یک نگاہوں سے ایسا اوجھل ہو گیا جیسے اُس کو گولی لگی ہی نہیں۔ مجھے بڑی مایوسا ہوئی۔ اُس کے بعد جو بندوق پر میری نظر پڑی تو دیکھا کہ اُس کی (sight) نشانہ لگانے سے قبل اوپر چڑھائی نہیں گئی تھی۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ میں نے جو نشانہ مارا تھا گولی اُس پر لگنے کے بجائے نیچے کی جانب نکل گئی اور ہاتھی پر کچھ اثر انداز نہیں ہوئی سچ ہے کہ

بدحواسی اور پراگندہ دماغی کے عالم میں جو کام کیا جاتا ہے وہ بگڑ ہی جاتا ہے ہاتھی ننگا ہوں سے تو او جھیل ہو ہی گیا تھا۔ مگر پھر بھی اُمید کی نفی سی دل میں گرمی باقی تھی۔ اسی گرمی کے اثر سے میں پھر بھی ہاتھی کے تعاقب میں نکلا کوئی میل دیڑھ میل جانے کے بعد راستے میں تازہ خون ٹپکا ہوا ملا۔ جو اس کا ثبوت تھا۔ کہ ہاتھی زخمی ہو کر ادھر سے بھاگا ہے۔ میری پڑ مردہ امیدوں میں کچھ تازگی پیدا ہو گئی۔ گوزخمی ہاتھی کا تعاقب انتہائی خطرناک ہے۔ تاہم میں بلا خوف اس کے تعاقب اور تلاش میں سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ اب میں تھک کر بالکل چور چور ہو گیا تھا۔ ایک مقام پر ٹیڑھ کر نصف گھنٹہ کمر سیدھی کی۔ پھر اٹھ کر تلاش میں نکلا۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر ہاتھی کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ہوا ہماری جانب سے ہاتھی کی جانب جا رہی ہے۔ میں نے آگے جانا ضروری نہیں خیال کیا بلکہ اسی مقام سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں تاک کر چلائیں ہاتھی پلٹ کر نہایت تیزی سے پھر غائب ہو گیا۔ میں پھر اس کی تلاش میں چلا۔ دو گھنٹوں کی سرگردانی کے بعد وہ ایک درخت کے نیچے نہایت اطمینان سے کھڑا ہوا نظر آیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ قاصدہ پر کھڑا ہو گیا۔

اس میں کلام نہ تھا کہ ہاتھی زخمی ہو چکا تھا۔ اسے پھیر

ہاتھی کے قریب جانا خطرے سے خالی نہیں اس لئے میں تقریباً
 ۳۴ گز ہی کی دوری پر ٹھہر گیا اور ایک اونچے درخت پر چڑھ کر
 ٹائٹل توڑتین گویاں چلائیں مگر اس کا علم نہیں ہوا کہ یہ گویاں اُس کے
 لگی یا نہیں، ہاتھی اب بھی ویسا ہی کھڑا تھا میرے دوسرے ساتھی
 اور منہ بوق بردار بھی درختوں پر چڑھ کر ہاتھی کے گرنے کا انتظار
 کرنے لگے۔ بہت دیر کے بعد ہاتھی خود بخود گرا پھر بہن کر کھڑا ہوا پھر
 گرا پھر کھڑا ہوا۔ پھر گرا ایسا کہ کھڑا ہی نہ ہو سکا۔ اور تھوڑی ہی
 دیر میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اس ہاتھی کے دانت کا جوڑا (۱۳۰۰ روپیہ) میں فروخت ہوا۔

ان تیرہ سو روپیہ میں سے ساڑھے
 سات سو روپے داخل کر کے
 نئے اجازت نامہ کا حصول
 اور خطرناک شکار کے مناظر میں نیا اجازت نامہ حاصل
 کیا۔ اس نئے اجازت نامہ کے تحت مجھے دو ہاتھیوں کے شکار کا حق
 حاصل ہوا من اتفاق سے میں نے ایک مہینے میں یہ دونوں ہاتھی مار لئے۔
 مجھے شکار کرتے کرتے اور دوران شکار میں عجیب و غریب
 حالات سے دوچار ہونے ہونے کافی تجربہ ہو گیا۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ہاتھی ایک درخت کی آڑ میں کھڑا
 تھا۔ میں آہستہ آہستہ دوسرے درختوں کی آڑ میں سے بندوق سمیت
 کھینکے کھینکے بالکل اسی درخت کے پاس پہنچ گیا۔ ہاتھی مجھ سے چند

فٹ ہی پر تھا۔ میں نے قیاس کیا کہ اگر اسی مقام پر ٹھہر کر دو تین فٹ کی دوری سے نشانہ لگایا جائے۔ تو گوئی پڈیوں کو توڑتی ہوئی اُس کے کیلچے میں درائے گی۔ اس خیال کے تحت میں نے بندوق اٹھائی اور اب گوئی چلانا ہی چاہتا تھا کہ یکایک ہاتھی نے سر نکالا اور تیزی سے میرے سامنے سے روانہ ہو گیا۔ میں حیران و ششدر رہ گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں اُس کی پشت کی جانب ہوں مگر میں جدھر پشت سمجھا تھا اس کا سر نکلا۔ میں نے جی کڑا کر کے پھر بھی گوئی چلا ہی دی جو معلوم نہیں اُس کے کس حصے میں لگی کیونکہ وہ گھبرا کر اس تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ میری نگاہ کام نہ کر سکی۔ یہ بھی خدا کا خاص فضل ہوا ورنہ اگر ہاتھی پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیتا تو پھر میری زندگی کا خانہ ہی تھا۔ غور کیجئے کہ یہ شکار کس قدر پر خطر تھا۔ میں نے چند میل تک اس کا تعاقب کیا۔ راستے میں کہیں کہیں ہاتھی کی تازہ لید دیکھنے میں آئی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اوہر سے گزرا ہے۔ مگر کافی تجسس اور دوڑ دھوپ کے بعد بھی اُس کا پتہ نہ چلا میرے تجربہ کار رہبر نے کہا کہ اب مزید تعاقب و جستجو بیکار ہے۔ کیونکہ ہاتھی کو کوئی سخت ضرب نہیں آئی۔ بالآخر میں ہمراہیوں سمیت واپس آ گیا۔

ایک مرتبہ میں شکار کے لئے ایک ہاتھیوں کے ہجوم میں ایسے جنگل میں جو بہت لمبی لمبی اونچی اونچی گھاس سے بھرا ہوا تھا اور اتنا گنجان کے خدا کی پناہ آدمی کا گزر

مجال تھا۔ البتہ کہیں ہاتھیوں کی آمد و رفت سے راہیں سی بن گئی
 تھیں۔ جن پر گزردہ وقت ٹھکن تھا۔ میں نے ایک درخت پر چڑھ کر
 دیکھا کہ فاصلے پر بہت سے ہاتھی گھاس چرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن
 اتنی دور سے ہاتھیوں کی واقعی تعداد اور امن کے صحیح رخ کا اندازہ
 نہ لگ سکتا تھا۔ اس نے میں درخت سے نیچے اتر کر ہاتھیوں کی پامال
 کی ہوئی راہ چلا۔ میں بائیں جانب تھا اور ہاتھیوں کی ٹولی داہنی
 جانب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ابھی مجھے چلے ہوئے دس منٹ گزرے
 ہوں گے کہ گھاس کی غیر معمولی سرسراہٹ سے میں نے تیس کیا کہ
 دو متفرق ہاتھی۔ ایک ساتھ ہو کر گنجان گھاس میں گہس کر چل رہے
 ہیں۔ مگر گھاس بہت ہی گنجان اور لمبی تھی جس سے ان کی رفتار،
 اور رخ رفتار کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو سکا۔ میں نے چاہا کہ آس
 پاس کوئی اور درخت مل جائے جس پر چڑھ کر گھاس میں چھپ کر
 چلنے والے ہاتھیوں کو دیکھ سکوں۔ مگر افسوس کہیں قریب کی ایسا درخت
 بھی نہ تھا۔ توڑی دیر میں ہاتھیوں کے گھاس میں گزرنے کی آواز
 بہت قریب محوس ہونے لگی۔ صرف آواز ہی کا احساس ہو رہا تھا،
 مگر ہاتھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس لئے یہ موقع نہایت خطرناک ہو گیا
 تھا۔ کہ کہیں ہاتھی بالکل میرے سامنے ہی نہ نکل آئیں اور یکایک مجھے سوڈ
 میں لپیٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اب میں سخت کشمکش میں تھا نہ آگے
 بڑھ سکتا تھا۔ اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ہاتھیوں کے پاؤں کی آہٹ

بندر سچا قریب سے قریب تر محسوس ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے وقت میں میرے لئے سوا اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ میں اور میرے ساتھی باپنی اپنی بندوقیں چلائیں۔ اس وقت ہمارے پاس چھ بندوقیں تھیں ہم سب نے آواز کی سمت پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اب آوازیں اور زیادہ تیز اور زیادہ قریب محسوس ہونے لگیں بلکہ یہاں تک دکھائی دینے لگا کہ ہاتھیوں کی سونڈوں کے سرے۔ ہمارے قریب کی گھاس کی سطح پر حرکت کر رہے ہیں۔ اور انسانی بومحسوس کر رہے ہیں۔ اب ہاتھی ہم سے زیادہ ۲۰-۲۵ فٹ پر ہوں گے۔ ہمارے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم کسی جانب بھی جاگ سکیں۔ مگر ہم نے اس میں خیریت محسوس کیا کہ متواتر گولیاں چلانے جائیں۔ ہمارے اس پیسہ عمل سے ہاتھیوں نے اپنا رخ بدل لے۔ اور وہ بجائے ہماری جانب بڑھنے کے دوسری جانب مڑ کر روانہ ہو گئے۔ ورنہ اگر وہ اپنے پہلے رخ پر ہی روانہ ہوتے تو ہم سب دن کے پاؤں سے دب دب کر مر رہے ہوتے۔ ہم نے اپنی گولیاں چلانی تھیں۔ ان میں سے کچھ نہ کچھ ہاتھیوں پر بھی پڑی ہی ہوں گی۔ مگر کوئی جانور مردہ یا زخمی نہیں دکھائی دیا۔ چونکہ یہ ساری گولیاں محض تباہ اور اندازہ ہی پر چلانی گئی تھیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ گولیاں بے ٹھکانے چلی ہوں۔

ہاتھیوں کے ہجوم میں ہماری یہ کاؤٹس دکوٹس گوبے نتیجہ ہی ثابت

ہوئی مگر اس سے ہماری جماتوں میں اضافہ ہوا۔

ایک مرتبہ میں شرکار کو گیا۔

کان کے پاس سے گولی...! جھنجھل میں ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوا جہاں سے میرے ساتھی کچھ پیچھے تھے اور میرے سامنے کچھ فاصلے پر ہاتھی تھا۔ میں نے گولی چلائی۔ مگر ہاتھی صاف بچکر نکل گیا۔ میری آنکھیں بھاگتے ہوئے ہاتھی کے نظارے میں مصروف تھیں۔ کہ یکایک ایک گولی میرے کان کے پاس سے "سن" سے نکل گئی۔ خدا کا خاص فضل ہوا کہ کپٹی یا سر کے کسی حصے میں گولی نہیں لگی۔ میں نے موڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بندوق بردار نے یہ گولی چلائی جو مجھ سے پیچھے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کا مقصد غالباً بھاگتے ہوئے ہاتھی پر نشانہ لگانا تھا۔ مگر میں اس نشانے کی زد سے بال بال بچ گیا۔ اس سانحہ سے میرا دل بہت پریشان ہوا اور دماغ پر عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس عالم ہیجان و اضطراب میں نے مفرد ہاتھی کا ثعاقب کیا۔ گھانس بہت گنجان اور لمبی لمبی تھی مگر میں برابر آگے بڑھنا جانا تھا اتنے میں مجھے کچھ فاصلے پر ہاتھی کا سر اور سونڈ نظر آیا۔ میں ادیرے ساتھی اس مقام پر رک گئے۔ اور اب جو بندوق اٹھا کر نشانہ لگانا چاہتا ہوں تو سامنے سے ہاتھی نثار و خیال ہوا کہ شاید ہاتھی بڑھ گیا ہو نہیں بھی آگے بڑھا۔ اور ادھر ادھر تمام چھان ڈالا مگر کہیں ہاتھی کا وجود بھی نہ تھا۔

خدا جانے یہ کیا ماجرا تھا۔ یا تو میرا یہ سب تخیل کی فریب کاریاں

ہیں۔ قوت خیالیہ کی شدت نے ایک موہوم ہاتھی کے سامنے
 کر دیا۔ یا کیا؟ جس طرح بعض بھگتوں کو ہنوماں کے درشن ہو جایا
 کرتے ہیں شاید اسی طرح مجھے گینزرجی کے درشن نصیب ہو گئے۔

میں اس نئے اجازت نامہ
کانگو کو (براہ منڈی) روانگی کی رو سے دو ہاتھیوں کا شکار
 کر سکتا تھا۔ سو دونوں شکار کر ہی چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے ارادہ
 کیا کہ میں کانگو جاؤں اور اُس علاقے میں دیگر یورپین شکاریوں کی
 طرح میں بھی شکار کروں۔ اس مقصد سے میں روانہ ہوا۔ منڈی
 ہوتا ہوا اور پیدل راستے کرتا ہوا منجا پوہنچا یہ بہت ہی دلکش
 اور پر فضا مقام ہے یہاں دریا کے نیل بہت بلند ہی سے گرتا ہے۔
 اس دنواز اور نظر قریب آبشار کا نام مرجس نال ہے اس کی آواز
 پانچ چھ میل کی دوری سے سنائی دینے لگتی ہے۔ اس میں کلام نہیں
 کہ یہ آبشار ایسی جگہ واقع ہے جہاں کسی کا گزر آسان نہیں
 تاہم نایل کے کنارے سے دو پہاڑ کی چوٹی تک ایک ننگ راستہ
 بنا دیا گیا ہے جس پر لوگ پیدل جا کر اس رنگین و خوش منظر مقام تک
 پہنچ جاتے ہیں۔ اس راہ پر چلتے وقت ایک جانب پہاڑ کی سر بفلک
 چوٹی ہے اور دوسری جانب نیچے گہرائی میں نایل ندی کے آبشار
 سے گرا تیزی سے بہنے والا صاف شفاف پانی۔ اس پانی کی سطح میں
 لانگداو مگر مجھ میں جو اپنے سراو پر کونکالے ہوئے نہایت آزادی سے تیرتے

پھرتے ہیں۔ یہ منظر خوش نما ہونے کے ساتھ انسانی قلب پر غیر معمولی
ہیبت بھی طاری کر دیتا ہے۔

منجاؤ سے میں بدریجہ کشتی کو بے پہونچا یہاں برٹش گورنمنٹ
کا ڈسٹرکٹ آفس (دفتر ضلع) تھا یہاں سے ایک روز کی مسافت
طے کر کے وٹر لائی پہونچا یہاں سے مذکورہ صدر مقام کو بے کو دفتر ضلع
منتقل کیا گیا تھا۔

وٹر لائی سے بلجیٹن حکومت کی سرحد ملتی

بلجیٹن علاقے میں شکار تھی اور اس سرحد کو عبور کرنا بھی یا

دشوار نہ تھا مگر ایک خیال بار بار آ رہا تھا۔ وہ یہ کہ بلجیٹن علاقے
میں ایک ارجنٹی ہندوستانی شخص کا اس غرض سے جانا کہ وہاں کے
ہاتھیوں کو شکار کر کے اُس ملک کی زندہ دولت یعنی ہاتھی دانت حاصل
کرے خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی حکومت ہی نہیں ہے اور
مطلقاً کسی کی داد فریاد سنی ہی نہیں جاتی یہاں کے لوگ بھی انتہائی
فالم اور سفاک ہیں اور عام باشندے وحشت و زندگی اور خونریزی
میں اپنی آپ شمال ہیں اس علاقے میں جانے کے معنی سوا اس کے
اور کچھ نہیں کہ سوئی ہوئی بلاؤں کو پھر جگایا جائے اور ان دیکھے
مصائب سے دوچار ہو کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھویا جائے لیکن میں
ارادہ کہہ ہی چکا تھا کہ مجھے اس علاقے میں جانا ضروری ہے اور وہاں
شکار کے ذوق کی تکمیل بھی لازمی ہے۔ اس لئے دورانہیشی اور مال سنی

میرے پختہ عزم کو مغلوب نہ کر سکی۔

اس وقت میرے ساتھ مزدور بندہ و قہر دار رہبر وغیرہ ملاکر کل ۶۷ نفر تھے۔ اور کافی سامان و اسباب بھی ساتھ تھا۔ خدا کا نام لیکر نائل ندی کو عبور کیا اور بلجین حکومت کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ہم سب پیدل تھے چلتے چلتے ۵-۶ گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس قدر چلنے پر سامنے ایک گاؤں دکھائی دیا۔

ہم لوگ کافی تھک چکے تھے
خونخوار و شیموں کے محاصرے میں
اس سے زیادہ چلنے کی ہمت

باقی نہیں رہی تھی یہی مناسب سمجھا گیا کہ سرد سہتہ یہیں قیام کرنا چاہیے چنانچہ اس گاؤں کے نزدیک ایک سایہ دار درخت کے نیچے اتر پڑے مزدوروں نے آدھے گھنٹہ میں میرا خیمہ وغیرہ نصب کر دیا اور میرے تمام ضروریات کی تکمیل بھی کر دی۔

میں اسی خیمہ کے سامنے ایک آرام کر سی پر دراز ہو گیا اور نفع کن دور کرنے کے لئے میں نے سٹوڈ انٹریک کر کے دسکی کا ایک جام چڑھایا۔ مزدور میرے کاموں سے نارغ ہو کر اپنے قیام کے لئے جو نیڑی وغیرہ ڈالنے میں بھرتی ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھنا ہوا کہ اس گاؤں کے لوگ آہستہ آہستہ آنے لگے۔ اور میرے ڈیرے کا گویا محاصرہ کرنے لگے۔ ان کی صورتیں اور وضع قطع انتہائی خونخاک تھی۔ ان کو دیکھ کر دل پر وحشت طاری نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ پھر یہ سب کے سب سلجھتی تھے

اگر میں ان لوگوں کی سیرت اور کردار سے یہاں آنے سے قبل ہی واقفیت حاصل نہ کر چکا ہوتا تو میں یہ خیال کرنا کہ بہ سبب ایک نئے مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی جاتی میری وحشت اور خوف میں اضافہ ہوتا جاتا۔ میں اپنے ساتھ اس صحرائی علاقے کے باشندوں کے مذاق و ضرورہ سنا کر بہت سی چیزیں خرید کر اس عوض سے لا با تھا کہ ان کے تیار کردہ میں ان لوگوں سے اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کر لوں گا یہ لوگ نقد سکہ کی کچھ قدر نہیں جانتے بلکہ پتیل تانبے کے تار امیشن کے رنگ، مختلف رنگ کے کاج کے دانے اور لڑیاں چمکنے دینے والے مصنوعی دھاتوں کے زیورات شیشے اور رنگین چینی کی چیزیں یہ اشیاء ان لوگوں کو مرغوب ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کی چیزیں میں بھی لایا تھا اور وہ سامنے بیٹھے ہی رکھی ہوئی تھیں یہ لوگ لحظہ بہ لحظہ مجھے اور میرے بیٹے سے قریب سے قریب ہوتے جا رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ محاصرہ کو درجہ بدرجہ مضبوط بناتے جا رہے ہیں اور ایک بارگی جھج پر اور میرے بیٹے پر حملہ کر دیں گے۔ میں کچھ زمانہ مشتری ہی یہ خیر سن چکا تھا کہ ان لوگوں نے ایک اطالوی شکاری کو جس کا نام بکیری (Buccire) تھا۔ نہایت بیدردی سے قتل کر کے اس کا سار سا مان لوٹ لیا تھا مجھے بھی اپنا شہر ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔

یہ لوگ برابر میری طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ جوں ہی ان کی نگاہ میرے لائے ہوئے سامان پر پڑی تو ان کی نگاہوں سے جھوس ہونے لگا کہ یہ نہایت بے صبری سے دیکھ رہے ہیں ان میں سے کچھ لوگوں نے ان چیزوں کو طلب بھی کیا۔

ان کی زہریلی نگاہیں ان کے بے باک تیور یہ کھ رہے تھے کہ یہ اپنے اوپر کسی طاقت اور قوت کو محسوس ہی نہیں کرتے اور نہ ان کو انسانی جان و خون کی قیمت کا علم ہے۔

ان کے ہاتھ اور جسم مختلف آلات قتل و جراحت سے آراستہ تھے اور کسی کو مار ڈالنا ان کے لئے معمولی دل لگی تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ان کا یوں ہجوم کرنا، اور پھر ایک خاص انداز پر میرے خیمے اور خود مجھ کو یوں محاصرہ میں لے لینا میرے لئے بید پریشان کن تھا۔ کیونکہ اول تو ان کی تعداد ہم سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے یہ کہ ہم لوگ بالکل اجنبی اگر ان کے حملوں کا جواب بھی دیں تو خدا جانے ہم کو اور کن مصائب میں مبتلا ہونا پڑتا۔ غرض ہمارے لئے ایک عجیب صورت تشویش تھی۔ اس وقت مجھے اس کا بہت خیال تھا کہ حتی الامکان میری جانب سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے اس محروم العقل و ہنذیب و رندہ منشن و حتی گروہ کو غضناک یا مشتعل ہونے کا موقع ملے۔ یہ باسانی ممکن تھا کہ میں ان کے مذاق کا جتنا سامان لایا ہوں سب ان کو دے دوں یہ خوش خوش چلے جائیں گے اور آپس

میں تقسیم کر لیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال تھا کہ اس کے بعد میں بالکل تہی دست ہو جاؤں گا اور میرے پاس اس علاقے میں رہا کہ قوت لایوت بھی فراہم کر نیکا کوئی امکان نہ رہے گا۔

میں اسی کشمکش میں تھا کہ یکا یک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ یہ کہ اگر ان سے مقابلہ ہی کی ٹھن جائے تو مجھے بھی پیچھے نہ ہٹنا چاہیے۔ بہر حال ان سے مقابلہ کرنا ہی مصلحت ہے۔ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دینا اس خیال سے بھی مصلحت نہیں ہے کہ یہ لوگ سب کچھ لے لینے کے بعد میں اگر ہماری جائین بھی لینا چاہوں تو ان کو کوئی معقولیت اس ارادے سے باز رکھ سکتی ہے۔ اور کونسا قانون مانع ہو سکتا ہے میرا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو اور یہہ لوگ تیرہ کمان کے فن میں بالکل پکھے ہیں۔ ہندوستان کی وحشی بھیل قوم کی طرح یہ تیراندازی میں کمالی نہیں رکھتے۔ لہذا اس موقع پر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

اب جب کہ وحشیوں میں اور ہم میں کچھ بھی فاصلہ نہ رہا تھا میں اٹھا اور چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کھڑا تھا اس کے تنے پر ایک کاغذ لگا کر آنے کے بعد وحشیوں کے ایک آدمی سے جو بظاہر ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر اشاروں میں کہا کہ اسے تیر کا نشانہ بناؤ۔ وہ ادبھی ہو گئے۔ ان کے تین چار آدمیوں نے کوشش کی متعدد تیر چھوڑے۔ لیکن کوئی بھی تیر نشانہ

پرنہ لگا۔ اس پر میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں روک دیا اور اسی کاغذ کو وہاں سے زیادہ فاصلے پر ایک گھنٹا تھوہر کا درخت مثل ٹائر کے تھا اس کے تنے پر لگا کر اپنے جگہ پر آیا میرے پاس ایک امریکن بندوق تھی۔ جس میں ایسا کارٹوس استعمال کیا جاتا تھا جو چلنے کے بعد لگ کر پھیلتا تھا۔ چنانچہ میں نے وہ بندوق لی اور اس سے نشانہ لگایا گوئی کاغذ میں لگ کر تنے میں گھس گئی۔ تھوہر کا درخت بہت نرم ہوتا ہے۔ اس نے تنے کو چھنی کر دیا اور اس کے لئے شاخوں کا وزن سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ ایک زبردست آواز کے ساتھ تنے سے اوپر کا حصہ نیچے آ رہا۔ میں وحشیوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا کہ ان پر اس آواز سے خوف طاری ہے اس موقع سے میں نے فائدہ اٹھایا اور جو وحشی میرے قریب ہی کھڑا تھا اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اور انتہائی غیض کی حالت میں دوسرے کی طرف پکا۔ مجھے غضب ناک دیکھ کر وحشی بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر کوئی ہمارے قریب نہ آیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح وہ رات گزار کر دوسرے دن علی الصبح اپنا کیمپ اٹھا کر وہاں سے چلتا بنا۔

ہاتھیوں کے جنگل میں

خدا خدا کر کے دوسرے روز ہم ایک ایسے گاؤں میں پہنچے
 جسے قدرت کی نوازشوں نے انتہائی سرسبز اور شاداب بنا رکھا تھا
 جل تہل پانی لہلہاتے ہوئے درختوں اور ہری ہری گھاس کی وجہ
 سے درندوں پرندوں اور چرندوں نے اس پاس اپنا اپنا سکنا
 بنا لیا تھا۔ بور کی گھاس جو ہاتھیوں کی خاص غذا ہے کثرت سے
 اگی ہوئی تھی۔ جس کے لئے ہاتھی غول درغول آتے رہتے تھے۔ شکار
 کے شوق میں تو ہم نکلے ہی تھے اس لئے۔ ع

ٹھہر پائے طلب! منزل یہیں معلوم ہوتی ہے

کہہ کر اسی مرغزار میں آبادی سے کچھ دور کھلے اور پر فضا مقام
 پر ہم نے اپنا ڈیر اجمادیا اور ایسا کچھ انتہام کیا کہ گاؤں کا ایک شخص
 بھی ار دگرد پھٹکنے نہ پائے۔ ابھی دو دن بھی گزرنے نہ پائے تھے

کہ ہمارا جز آیا اور اپنے ساتھ یہ خوشخبری لایا کہ پاس کے جنگل میں بہت سے ہاتھی آئے ہیں یہ سنتے ہی خوشی سے میرا دل بلیوں اچھیلنے لگا۔ فوراً بندوق اور کار توں میں گھر اپنے آدمی کے ہمراہ جھاڑ جھنکار کو دتے پھانڈتے ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر دیو پیکر ہاتھیوں کے منڈے کے قریب ہی پہنچ گیا۔

دوسرے جانوروں کی طرح ہاتھی بھی جنگل میں اپنا شکار میں چرنے کے لئے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری سمت جاتے وقت سب بیجا ہو جاتے ہیں اور پھر قیادت کرنے والا ہاتھی جس سمت چلنے لگتا ہے اسی سمت اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ شاید ہماری بڑی وجہ سے ہمارے آنے کا ان کو احساس ہو گیا ہو اور سب جمع ہو کر ہمارے بائیں جانب جاتے ہوئے دکھائی دئے۔ بڑے دانت کے ہاتھی جو صف اول میں چل رہے تھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے قدم بڑھا کر پھرتی سے دو ہاتھیوں پر فر کیا۔ ایک ہاتھی اگلے دو قدموں پر گر کر اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر ادھر ادھر بازو پھیرنے لگا میں نے جلد جلد اور کئی فیڑ کئے تاکہ سنبھل کر بھاگنے نہ پائے۔

ہاتھی گر گیا اور میں اپنے اس علاقے کے پہلے شکار پر خوشی سے جھومتا ہوا بھاگے ہوئے گردہ کے تعاقب کے لئے آگے بڑھا تو... ۵ گز کے فاصلہ پر دوسرا ہاتھی بھی مرا ہوا نظر پڑا جو پہلے کھائل ہو چکا تھا ایک ہی دن میں دو ہاتھی ملنے کا موقعہ شکاری کو بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی تھی۔ جاتے وقت تو افناں و نیزان گیا تھا لیکن واپسی میں انتہائی مسرت سے خراماں خراماں تقریباً تین بجے تک اپنے ڈیرے میں واپس آگیا۔ کھانا کھا کر تھکن دور کرنے کے لئے کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔

شام کے وقت میری اس کامیابی کی **مجھے مبارکباد دی** خبر سنکر پٹیرس نامی ایک شکاری بھی آکر میرے خیمے کے قریب ہی خیمہ نہ لگا ہوا وہ بیچارہ کئی ماہ سے اس علاقہ میں شکار کر رہا تھا لیکن کسی روز بھی اُسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجھ پر انتہائی رشک ہوا۔ باوجود اس کے اُس نے ایک ہی دن دو بڑے دانت والے ہاتھی ملنے پر مجھے مبارکباد دی اس سے میری ہمت افزائی ہوئی اور شکار کا انگ میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا۔ اس شکاری کے پاس ایک دو ٹیلیوں والی ایک بہتر سیرا نقلی اس کی زاید تھی جس کی قیمت تقریباً سات یا آٹھ سو سے کسی طرح کم نہ تھی

اس کو میں نے بنا دیا ضرورت دو دانتوں کے عوض حاصل کر لیا اور سمجھا کہ بہت سستے داموں حاصل ہوئی مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سو دانتا نہیں بلکہ بہت ہنگامہ پڑا ہے کیونکہ اس وقت ایسے دانتوں کی قیمت اٹھارہ سو اور دو ہزار کے درمیان تھی آدمی کو کسی چیز کی قیمت معلوم نہ ہو یا کوئی چیز بہ آسانی حاصل ہو جائے تو اس کی زیادہ قدر نہیں کرتا۔ بلکہ بسا اوقات محل کو بھی پتھر کے بھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ ہمیں یہ تھوڑی ہی محنت سے حاصل ہوئے تھے۔ کم قیمت پر فروخت ہونے سے ہمیں کچھ زیادہ رنج نہ ہوا۔ ٹیبرسن کی طرح اور دس پندرہ شکاری اس لارڈ انکلاڈ میں ہاتھی کا شکار کر کے ہاتھی دانت حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایک جرمن ایک اطالوی اور ایک ہندوستانی کے علاوہ باقی سب انگریز تھے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریز کس طرح زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد روزانہ جنگل جانا اور شکار کی جستجو کرنا میرے معمول میں داخل ہو گیا۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اس نواح میں درندے پرندے اور چرندے کثرت سے پائے جاتے ہیں، جگہ جگہ جنگلی بھینس اور گینڈے بہت ملتے تھے لیکن میں نے ان کا شکار کرنا اور کارٹوسوں کو بیکار کرنے کے مترادف سمجھا۔ صرف ہاتھی

کے شوق میں اپنے قیام گاہ سے سو سو سو میل آگے تک نکل گیا اور دریا کے نائل کے کنارے قیام پذیر ہوا۔

ایک دن مقامی لوگوں کی طرف سے یہ وقتناک میرا فرار جزلی کہ بلجین سہکار کے سپاہیوں کا ایک گروہ مجھ جیسے غیر اجازتی کالے شکاریوں کو جان سے مارنے کے لئے آ رہا ہے میں نے یہ سنتے ہی فوراً کیمپ اٹھایا اور برطانوی حدود کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے رات کے دس بجے دریائے نائل کو عبور کر کے برطانوی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس دوڑ دھوپ میں تھک کر چور ہو گیا تھا کئی گھنٹہ تک بیہوش سا پڑا رہا ساتھی کے بھی حواس کچھ ٹھکانے نہ تھے مگر برطانوی حد پر پہنچنے سے ہار جان میں جان آگئی ایک اطمینان نصیب ہوا۔ ڈیرہ نصب کر کے چند روز ہم نے آرام کیا ایک دن ایک شخص نے یہ خبر سنا لی کہ میرا زخمی کیا ہوا ہاتھی مر گیا اور اس کے دانست گاؤں کے پٹیل نے اپنے پاس رکھ لئے ہیں۔ اتفاق سے ان نرے ڈاس نامی ایک یورپین شکاری بھی وہاں شکار کر رہا تھا۔ پٹیل نے ایک دانست اس کا شکار سمجھ کر اس کے حوالے کر دیا ہے اور ایک پر خود قابض ہے یہ سنتے ہی میں آگ بگولہ ہو گیا اور مجھے ایک پرانا مقولہ یاد آیا۔

انڈیہ دے بی ناختمہ کوئے بچ کھا جائیں

عصہ سے میں جلد ہیمیاڈوں سے لیس ہو کر مذکورہ گاؤں میں داخل ہوا یہ گاؤں چاروں طرف بانسوں کے چھ سات فٹ اونچے مضبوط جالیوں سے گھرا ہوا تھا اور آنے جانے کا راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک آدمی مشکل سے پار ہو سکتا تھا خیر میں اس میں داخل ہوا اطراف کی تمام بستیاں اسی طرح بانسوں اور کانٹے دار درختوں سے گھری ہوئی تھیں دن اچالوں کے اندر گاؤں کے لوگوں کی گھانسی کی جھونپڑیاں تھیں اور ان جھونپڑیوں میں رہنے والے انتہائی محنتی جفاکش اور بہادر تھے۔ میں نے گاؤں میں داخل ہو کر ٹیبل سے ملاقات کی اور اپنے مقصد کو اس پر یا کسی اور پر ظاہر ہونے نہ دیا اور چکی چٹری اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے پیٹل کو بستنی کے باہر لے آیا اور جب میں یہ سمجھا کہ اب میں گاؤں والوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہوں تو آہستہ آہستہ سے دانت کا مطالبہ شروع کیا اور وہ بات کو ٹالنے والے جوابات دینے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ جس طرح گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلا کرتا اسی طرح سیدھے طریقہ سے دانت کا حاصل کرنا بھی مشکل ہے۔

تب میں نے یکا یک تیور بدل کر بھری ہوئی بندوق پیٹل پر حملہ کیا ناں اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا کہ ہاتھی دانت فوراً حوالہ کر دو ورنہ میں نہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں

قطم دیرین نہ کروں گا۔ اس کا فوری اثر ہوا پیشل نے اپنے ساتھی کو دانت لانے کے لئے کہا جب تک میں نے اس سے دانت وصول نہ کر لیا اس کو وہاں سے ہٹنے نہ دیا۔

دانت لے کر جو نہیں میں اپنے ڈیرے میں
یک اور حق دار داخل ہوا ڈاسن آیا اور اس پر اپنا حق
 جیتانے لگا بہت ہی ر د و تدح کے بعد یہ طے پایا کہ یہ معلوم
 کیا جائے کہ مرے ہوئے ہاتھی میں سے گوئی کس کی نکلی ہے قبل
 اس کے تحقیق کی جائے ڈاسن بچھر گیا اور اپنے جسمانی طاقت
 کے بل پر اس نے اس بحث کو ختم کرنا چاہا میں نے یہ دیکھتے ہی
 اپنا ریو اور اٹھایا اور اس کا رخ اس کی چھاتی کی طرف کر دیا
 فوراً میری تمام شرائط منظور کر لیں

صلح

بڑا مزہ اس صلاب میں ہے
 جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ڈاسن کے ہمراہ میں نے اپنا آدمی کر دیا اور وہ دونوں اس
 گھاؤں کو گئے جس میں وہ شخص موجود تھا جس کے پاس مرے ہوئے
 ہاتھی کے جسم میں کی گوئی تھی۔ تلاش کے بعد شخص مذکور ملا اسے
 مدد گوئی میرے پاس لایا گیا میں نے بنظر غار گوئی کو دیکھا وہ گوئی

میری بندوق کی لذت تھی۔ کیونکہ وہ گولی ۶۰۰ بور کی بھی اور میسری
بندوق ۷۷۵ بور کی تھی تب میں نے بخوشی جان کو جو کہوں میں
ڈال کہ لایا ہوا ہاتھی دانت ڈاسن کے حوالے کر دیا ڈاسن نے شکر یہ
اد کیا اور ہم دونوں پچھلے واقعات پر پر وہ ڈالتے ہوئے آپس
میں ہنسیگے ہوئے اور اپنی اپنی راہ لی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک ہاتھی پر میں نے گولی چلائی
ہاتھی مر گیا مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ نہیں بلکہ مادہ ہے تو مجھے
اتہائی مایوسی ہوئی کیونکہ برطانوی حد میں مادہ اور جس کے دانت
۳۰ پونڈ سے کم وزن کے ہوں مارنا قانوناً جرم ہے۔ اس لئے میں
نے اس لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ
کے بعد ہاتھیوں کا گروہ پھر سامنے آتا ہوا دکھائی دیا میں فوراً
ہی سنبھل گیا۔

ایک ہاتھی قریب ہی ایک

شکار کی خود شکار کے پھندے میں جھاڑ کے پیچھے دیکھائی دیا
جھاڑی اور میرے درمیان ۱۰ گز کا بل تھا اس کی آڑ سے اور
دس بیس قدم آگے بڑھا ہاتھی بالکل سامنے اور میرے زردیوں آچکا
تھا میرا خیال تھا اس کی پیشانی پر ایک گولی چلا کر اس کا خاتمہ
کر دوں گا اس لئے میں نے اپنے ایک نالی وزنی بندوق سے نشانہ
جا کر گولی چلائی ہاتھی سینے گرتے ہوئے دکھائی دیا لیکن پھر سنبھلتے

ہوئے بھی نظر آیا اس نے اپنی مونڈا اوپر کر کے ایک خوفناک چیخ ماری یہ چیخ مجھے ریوے ابنجن کی سیٹی کی سی معلوم ہوئی اور وہ میرے طرف دوڑا لیکن مجھے اس کے حملہ سے کچھ خوف نہ ہوا۔ کیونکہ گولی چلنے کے بعد میرے بندوق بردار شخص مسمی جاتے دوسری دونامی والی ۷۷ ہولہ کی بندوق مجھے دے دی اس دفعہ میں ہاتھی چار پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر آ پھنچا میں نے بندوق اٹھا کر اس کے دو گھوڑے چلا دئے لیکن بندوق نہ چسپی بندوق کے نہ چلنے سے اوسان خطا ہو گئے میں نے سمجھا کہ بندوق بگڑ گئی ہے۔ اب اپنی حفاظت کے لئے سوائے بھاگ نکلنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بھاگتے بھاگتے پاؤں شل ہو گئے۔ اب آگے بڑھنے کی طاقت نہ تھی نہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت ایسا معلوم ہوا کہ اب میں گرا چاہتا ہوں بمشکل پیچھے مڑ کر دیکھا ہاتھی دکھانی نہ دیا۔ میں تو ملک الموت کے پیچے سے صبح و سلامت نکل گیا لیکن جا کا کیا حشر ہوا ہاتھی میرے پیچھے نہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاں تعاقب کیا ہوگا ہاتھ پاؤں کا پنے لگے۔ زبان خشک ہو گئی منہ سے بات نہ نکل سکی۔ یہ تھی نھوڑی دیر نیم جان حالت میں پڑا رہا۔ نھوڑی دیر کے بعد کچھ طبیعت سنبھلنے پر جہاں تلاش میں نکلا۔ نھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا پھر آہستہ آہستہ بڑی ہوشیاری سے ڈرنا ڈرتا واپس لوٹا۔

اور زور زور سے جما کا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا بلاخر جما نے جواب دیا جواب سنتے ہی جان میں جان آئی اور اس وقت مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

جما پر اس عرصہ میں
جما کی آپ بیتی (Jama)

جو کچھ گذری اس کی بیتی
اسی کی زبان سے سنئے ”جب میں نے آپ کو دونالی والی بندوق
دے کر ایک نالی والی بندوق کو میں نے لیتا آپ پر ہاتھی کو حکم کرتے ہوئے
دیکھا۔ اس لئے میں حملہ کے رُخ کو چھوڑ کر قصد آسیدھی جا تب
بھاگنے لگا۔ اس موقع کے لئے میرا ایا کرنا ہی بہتر تھا۔ میں بھاگتے
بھاگتے زمین پر گر پڑا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھی پاؤں
سے پاؤں ملائے کھڑا ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھی نہیں
بلکہ موت میرے پاؤں سے اپنا پاؤں ملائے کھڑی ہے، اب
یوہنی پڑے رہنے کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی تھوڑی دیر بعد
ہاتھی خود چند قدم آگے بڑھ کر گر پڑا اور میری جان بچی، گویا ہاتھی
کا جما کا تعاقب کرنے سے میری جان بچی اور جما کی جان زمین
پر گر پڑنے کی وجہ سے۔

یہ بتلانا ضروری معلوم ہوتا
ہے کہ یہ آفت ناگہانی ہم پر
کس طرح آئی ہو۔ اور کیوں؟ بات صرف اتنی ہے کہ، ہاتھی کو حملہ

۱۳۰
 کرتے دیکھ کر حسب عادت جمانے بند و قی کا سنیٹی کیا ج اور اٹھائے
 بغیر میرے ہاتھ میں دے دی اور میں بدحواسی میں اس کا حینال نہ
 کر سکا اسی لئے یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی۔

اس مصیبت کے نزول کے چند دن بعد یکایک

مبہاسہ کو واپسی میں دوبارہ بلیک فیور (BLACK FEVER)
 میں مبتلا ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ میں
 ۱۹۰۰ء میں پھر واپس مبہاسہ آیا

مبہاسہ میں میرے ایک پرانے رفیق مسٹر
 مبہاسہ میں کاروبار کلاشنکر ایک عرصہ سے کاروبار کر رہے

تھے۔ اور اچھی طرح کام چل رہا تھا۔ چونکہ میری صحت بیدگری ہوئی
 تھی۔ ایسی حالت میں خود اپنا مستقل کام چلانا مناسب نہ سمجھتے ہوئے
 اپنی رقم میں نے ان کے سپرد کر دی جس کی وجہ سے انھیں اپنے
 دھندے میں بڑی مدد ملی۔ میں دیپنی صاحب کے مکان پر مقیم
 تھا۔ یوں تو میں ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ ہر روز ان کے
 آفس جایا کرنا تھا وہ امپورٹ کمیشن ایجنٹ کا کاروبار کیا
 کرتے تھے جسے ہر چند سمجھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا، ہنڈی
 سے کیا مراد ہے۔ مدنی ہنڈی کسے کہتے ہیں۔ بل ڈکونٹ کیا
 بلا ہے۔ حتیٰ کہ جمع اور خرچ بھی سمجھ نہ سکا چند دن یہی گزرتے
 رہے صحت یہاں بھی خراب ہی رہی۔

حصولِ صحت کے لئے بالآخر اپنے پیارے
 ہندوستان کو واپسی وطن ہندوستان ہی کو واپس آنا بہتر
 سمجھا اور ہندوستان آنے والے جہاز پر سوار ہو گیا یہ جہاز انتہائی
 غلیظ تھا اور مسافر بھی بہت زیادہ تھے۔ ایک حصہ سے دوسرے
 حصہ تک جانے کے لئے بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا

ہندو دھرم کی تنگ نظری یوں تو جہاز میں بہت سے
 واقعات پیش آئے لیکن یہاں

کا صرف ایک دردناک ذکر کرتا ہوں۔ ہوا یہ کہ اس جہاز میں ایک
 ہندو بیمار زرگر بیماری کی حالت میں ہندوستان جانے کے قصد
 سے سوار ہوا تھا قبل اس کے کہ وطن تک پہنچے اس کی موت اس
 تک پہنچ گئی۔ جہاز میں سفر کرنے والے دوسرے ہندوں سے کہا
 گیا کہ اسے غسل دے کر اپنے مذہبی عقائد کے موافق کپڑا لپیٹ کر
 سمندر میں ڈالنے کے لئے جہاز رانوں کے حوالے کریں۔ لیکن ان
 پوتر لوگوں میں سے کوئی بھی اس کے لئے تیار نہ ہوا کیونکہ وہ زرگر
 کے فرقہ سے نہ تھے۔ یہ گفت و شنید کوئی پون گھنٹہ تک ہوتی رہی
 جب مجھے اس دھخراش سانحہ کی اطلاع ہوئی تو انتہائی دکھ ہوا
 جملہ گجراتیوں کا یہی جواب تھا کہ وہ اس کے فرقہ سے نہیں ہیں،
 مسلمان بھائی جن کے ساتھ ہم اچھوت اور بیچھ کا سلوک رواں
 رکھتے ہیں۔ ہم ہندوں کا ہندو میت کے ساتھ غیر مہذبہ و اناہ

سلاوک دیکھ کر اچنبھا کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم اپنے مذہب کے مطابق اس میت کے آخری مراسم ادا کرنے کے لئے قطعی تیار ہیں۔ کیونکہ ہم ہندو مراسم سے واقف نہیں۔ یہ عالم دیکھ کر مجھے ہندو دھرم کے متعلق بہت صدمہ ہوا اور اُس کے خلاف حقارت کے جذبات پیدا ہوئے اور دل میں کہا خدا یا یہ دھرم دنیا کے تختہ سے مٹ جائے تو اچھا ہے کیونکہ یہ انسانیت کے لئے نیک ہے

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہندوستان کی غلامی کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں اس چھوت چھات کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے اس اونچ اور نیچ نے ہماو غلامی کی زنجیروں میں جا پڑ رکھا ہے جب تک یہ اونچ نیچ ختم نہ ہوگی ہماری غلامی کی زندگی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ انھیں خیالات کو لئے ہوئے میں آگے بڑھاؤ کو غسل دے کر اور کفن پہنا کر دفن کرنے کے لئے جہاز رانوں کے حوالے کیا جہاز ران اتفاق سے سب کے سب مسلمان تھے۔ جنہوں نے حسب معمول میت کی آخری تعظیم کے لئے جہاز کے انجن کو بند کر دیا جہاز ہٹ جانے کے بعد انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ کرین کے ذریعہ میت کو ایک تختہ پر ڈال کر سطح آب پر اتارا گیا۔ جس لاش کو چھونے کے لئے بھارت کے پوتروں کی انگلیاں تک نہ بڑھ

سکینت تھیں اس انسانی لاش کو انتہائی مقدس سمجھتے ہوئے سمندر
 کی پر وقار موجیں خوش آمدید کہتی ہوئی آگے بڑھیں اور اپنے وسیع
 آغوش کو وسعت قلبی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کی امانت دار
 بنا لیں۔ اس آخری رسم کے بعد جہاز روانہ ہو گیا۔ مجھے اس
 رسوائی کی زندگی پر افسوس ہوا اور اس موت پر رشک بھی آیا ہے
 ہوئے مر کے ہم جو رہ سوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
 نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

تین ماہ تک میرا قیام ہندوستان
 ہندوستان میں قیام میں رہا اجنار کالی کے مدیر پانچے پہلی
 مرتبہ جیل میں جانے کے بعد ان کی جگہ کام کرنے والے مٹر پر شو تم
 پنت کھرے کی رہائی جیل سے ہوئی تھی معافی نامہ داخل کرنے
 کے باوجود ان کو چھ ماہ کی سزا دی گئی اور ان کے اس فعل کی وجہ
 سے سزا بھگتنے کے باوجود بھی ان کو اہل پونہ کی ناراضگی حاصل کرنی
 پڑی قید سے رہائی کے بعد وہ احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے
 تھے اتفاقاً ان سے میری ملاقات ہوئی اور انھوں نے مذکورہ
 بالا واقعات کا اعادہ کیا۔ معافی نامہ داخل کرنے کی وجہ انتہائی
 اصرار پر بھی انھوں نے نہیں بتلائی صرف اتنا کہا کہ اس کا مقصد
 یہ نہیں تھا کہ مجھے جیل کی تکالیف سے نجات ملے۔ جیل تو خدام
 وطن کا گھر ہے۔ فیروز کچھ بھی مقصد ہو۔

افریقہ کو واپسی کچھ دن اور قیام کر کے میں پھر افریقہ جانے لگا
 تو مسٹر پر شو تم پنت بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ اور
 کئی سال تک میرے ساتھ افریقہ میں رہے میں وہاں جا کر پھر
 حصول معاش کے لئے دیسائی کے ساتھ ملکر تجارت کرنے لگا۔

۱۹۱۲ء میں مجھے ایک موقع
 ساولے سیاسی میدان میں
 پر ایک جلسہ عام میں ایک قرار

داد کی تائید کے لئے مجبور کیا گیا میں انتہائی مجبوری کے عالم میں
 بادل نخواستہ کھڑا ہوا تھوڑی سی تقریر کے بعد جسم پر سپینہ آنا
 شروع ہوا زبان رکنے لگی جوں توں کر کے تقریر کو ختم کر دیا۔
 اس کے بعد مجھے گاہے گاہے اجلاس کے اصرار سے تقاریر
 میں حصہ لینا پڑا کچھ مدت بعد جلسوں میں بولنے کی کافی مشق ہو گئی
 لوگوں نے پکڑ کر مجھے انڈین ایسوسی ایشن

انڈین ایسوسی ایشن کا مہتمم بنا دیا یہ سکرٹری ٹپ مجھے اس
 لئے نہیں ملی کہ میں کسی نہر میں یکتا تھا بلکہ یہ نوازش صرف اس
 وجہ سے ہوئی کہ وہاں کھلے طور پر کوئی کام کرنے کے لئے آمادہ
 نہ تھا، تجارت پیشہ حضرات ان امور سے لاعلم اور تعلیم یافتہ
 طبقہ ملازمت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس میں کام کرتے
 کرتے مجھے قومی امور سے دلچسپی بڑھنے لگی میں نے مشرقی افریقہ
 یوگانڈا۔ زنجبار اور اس وقت کا جرمن مشرقی افریقہ جو اب

ٹہنا ننگہ نیکہ ٹیری ٹیری کہلاتا ہے ان سب مقامات کا دورہ کیا اور ان حصول کے تجاوت پیشہ حضرات اور لیڈروں سے ملاقات کر کے بمبارہ میں کانگریس کا اجلاس منعقد کرنے کے لئے ان کی ہمدردی حاصل کی۔ دارالسلام میں ہندوستانیوں کو وہاں کے نیگرو کے مقابلہ میں کوئی زیادہ حقوق نہ تھے البتہ گوا کے ہندو کو یورپ کی فوجی حکومت کی عدالت برائے نام تھی کورٹ میں دعویٰ دائر کرنے کی صورت میں مدعی اور مدعی علیہ ہر دو کو کھیل کی ممانعت تھی عہدہ دار جو کچھ حکم دے وہی انصاف تھا عدالت کیا تھی۔ جبر و تعدی کا ایک سرگرم ادارہ تھا۔

میں نے دارالسلام میں تمام بیوپاریوں کو بلا کر ایک جلسہ منعقد کیا اس وقت کے مشہور بیوپاری سری پت نام سردیر جی صاحب جو ایک مشہور اور بااثر شخص تھے جلسہ کے صدر بنائے گئے اور اسی جلسہ میں دارالسلام انڈین اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔

حالات کا حقیقی نظر سے مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا کہ برطانوی مقبوضات میں جو حقوق ہندوستانیوں کو حاصل تھے اس قدر اختیار بھی جرمن سرکار ہندوستانیوں کو دینے کے لئے آمادہ نہ تھی ان کی اکثر حکومت ہندوستانیوں کے لئے کسی قدر تکلیف دہ تھی اور اس میں اصلاح کی کس درجہ اور کہاں کہاں گنجائش ہے؟

ان امور کا احساس وہاں کے باشندوں کو کرانے کیلئے کوئی کامیاب راہ سولے انڈین ایسوسی ایشن کے نظر نہ آتی تھی اس لئے میں نے اس پر زور دیا اور متحد ہونے کے لئے اپیل کی، اپیل کا کافی اثر ہوا۔ اور ہمارے انجمن نے ایک مضبوط اور بااثر ہندوستانی سماج کی حیثیت اختیار کر لی جسے جرمن سرکار نے بھی تسلیم کر لیا۔ یہ انجمن اب تک وہاں قائم ہے اور سرگرم کار ہے۔ کانگریس کے انعقاد کی تاریخ مقرر کی گئی میں اور رام بھائی بیٹیل اس کے شریک معتہ بنے اس کانگریس کے کام میں اس وقت کے مشہور تاجر سیٹھ طیب علی، جیون جی، سیٹھ عبد الرسول علی وینا ویشرام وغیرہ نے دل کھول کر مالی امداد کی۔

ان کی ان ہمدردیوں کی وجہ سے کام کو آگے بڑھانے کا جوش پیدا ہوا اور ڈھوپ کے سارے کام ہم لوگوں نے پائے تکمیل کو پہنچائے لیکن تقاریر سے متعلق نظام العمل بنانے کا کام ہم لوگوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ حسن اتفاق سے ان دنوں ایل ڈبلیو ایچ نامی ایک بیرسٹر صاحب جہنوں نے جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے زیر نگرانی بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے اپنے کسی کام سے فیروبی آئے ہوئے تھے ہمیں جیسے ہی اس کی خبر ملی۔ ہم نے تار کے ذریعہ ان کو دعوت دے کر بلا یا پتھے یہ بیرسٹر صاحب نوآبادیوں کے ہندی مسائل سے اچھی طرح واقف

سے ایک ہی رات میں انھوں نے جملہ مضامین تیار کر لئے جن کا ہم نے گجراتی میں ترجمہ کر لیا۔ اور مناسب ترمیم و اضافوں سے ان کو ہر حیثیت سے مکمل کر لیا۔ ہماری جماعت الغرض ہر طرح منظم اور باقاعدہ بن گئی۔

میرا ذاتی کاروبار اس وقت میں ایک محدود کمپنی کا ڈائریکٹر اور جنرل مینجر تھا اس کمپنی کا کام بہت زوروں پر تھا اس کی ترقی کا دار و مدار تمام تر مجھ ہی پر سیاست میں شرکت کی وجہ سے اس کام پر جو اثر پڑا اول اول تو مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا آئندہ عرض کروں گا کہ میرے سیاسی شغف نے میرے کاروبار کو کس درجہ مجروح کیا یہ داستان دراز بھی ہے اور دوسوز بھی ! لیکن میرے سامنے ہر حال میں یہ شعر

در رہ منزل لیلے کہ خطر است ایجان

شرط اول قدم آنت کہ مجنوں باشی

سو، لیلی سیاست کے عشق و محبت کے لئے اُس کے مجنوں کو جس جس وادی سے گزرنانا گزیر ہے۔ میں اُن سے بخوشی گزرا اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے استقلال عطا فرما کر مجھے تنگ محبت ہونے سے بچا لیا۔

ساولے موت کے تخت پر

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
 یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا
 ماہ جولائی ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ عظیم کا آغاز
 ہوا ہماری سرحد جرمن افریقہ کی سرحد سے ملحق تھی۔ جنگ کی
 آگ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی، مارشل لا کا نفاذ ہوا،
 لیکن میں نے اپنی سیاسی جد و جہد کو اسی طرح جاری رکھا،
 جنگ شروع ہونے کے چند ماہ بعد حکومت نے ریٹج صاحب کو شہر
 بدر کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہم پر بھی کسی قدر خوف طاری ہوا،
 تاہم ہماری جہد و جہد بالکل بند نہیں ہوئی اس وقت ریلوے
 میں ہندوستانیوں ہی کی زیادہ تعداد تھی حکومت نے ان کی تعداد
 اور تنخواہوں میں کمی کرنا شروع کر دی اس خصوص میں ہم نے
 ایسے ادارہ کی جانب سے ریلوے منجر کو احتجاجی خط لکھ کر اپنے

جدوجہد کو جاری رکھنا ٹرڈ بی اور بمبارہ میں ریلوے میں
 ہڑتال شروع ہوئی جس میں ہم نے اہم حصہ لیا یہ معاملہ
 تھوڑے ہی دنوں میں فیصل ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے ہمارے
 دشمنوں کی تعداد اور بڑھی۔ جرمنی کے داؤ پیچ کی وجہ سے
 برطانوی عہدہ دار بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ ہمارے
 ہندوستانی سپاہیوں کی ہمت بیٹھ چکی تھی۔ چھ سو میل ریکولائن
 کی حفاظت کرنا نہایت ہی مشکل کام تھا۔ روزانہ رات میں
 کہیں نہ کہیں دشمن آکر بموں کے ذریعہ لائن کو نقصان پہنچا یا
 کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے برطانوی عہدہ دار اشتعال میں آئے
 گئے اور دشمن کا غصہ اٹا ہندوستانیوں پر اتار ڈالا۔ بعض
 بدیاطن لوگوں کو بھی اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل باہمی عداوت
 دحد کے لئے یا خانگی معاملہ میں دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے
 ہزر رسانی اور ایذا رسانی کا موقع ہاتھ آ گیا۔

ایک شخص کو برطانوی حکومت کے خلاف کسی کے سلسلے کچھ کہنے
 کی پاداش میں فوجی قانون کے تحت سزا دی گئی۔ ایک سنار
 کے پاس جب کہ وہ اپنے وطن جا رہا تھا۔ سکا ندھی کے انڈین بوم
 ردل کی گجراتی کاپی پائی گئی۔ سنار نے یہ کتاب اپنے بچہ کو دینے
 کے لئے بمبارہ کے ایک مطبع سے خریدنی تھی۔ وہ خود بھی پڑھنا بھی
 نہ جانتا تھا۔ اس کو وطن جلفے سے روکا گیا اور جس مطبع سے یہ کتاب

خریدی گئی تھی، اس کی تلاشی نے کرکل کتابین ضبط کر لی گئیں اور
 مانک مطبع سری بالاشنکر بہ کو، ممنوعہ لٹریچر رکھنے کے خود ساختہ
 جرم میں چھ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ سے اکثر
 لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ بہا تاجی کی یہ کتاب بالکل بے ضرر
 تھی۔ حکومت نے اس کے خلاف جو گرمی دکھائی بخانے اس کی معافی
 ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس کیا ہے۔

یہ حال دیکھ کر میں نے اپنے مکان
میسری گرفتاری میں بھی ہوی یا چھپی ہوئی کوئی
 کتاب تو کیا معمولی کاغذات تک نہ رکھے۔ کیونکہ معلوم نہیں
 کب اور کس وقت کونسی کتاب اور کونسا اخبار خلاف قانون
 قرار دیا جائے اور مفت میں ہماری گردن ناپی جائے آخر
 ایک دن بہا سے میں فوجی لوگ ایک ہی وقت دس آدمیوں
 کو گرفتار کر کے جیل لے گئے اور ان کی غیر موجودگی میں انکے
 مکان کی تلاشی بھی لی گئی۔ گرفتار ہونے والوں میں ایک میں
 بھی تھا۔ ان خانہ تلاشیوں میں جو مال و متاع ہاتھ لگا ضبط کیا
 گیا۔ تمام کاغذات چاہے وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی سب
 قابل ضبط قرار پائے۔ اور مکان والوں کی طرح میرے مکان
 والوں کو بھی حکم ہوا کہ بنیر کچھ لئے ہوئے فوراً گھر سے نکل جائیں،

جب خانہ تلاشی کے لئے سرکاری
میرا بیوی کی ہوشیاری
عمال مرے گھر پہ پہنچے۔ میری
بیوی للتا جھوٹی لڑکی سرلا کو لے کر باہر نکل گئی باہر نکلنے وقت
کچھ زیورات اور رقم اپنے جیب میں چھپا کر لے جانے میں کامیاب
ہو گئی ورنہ ان کا تلاشی میں باقی رہنا ایک ناممکن سی بات
تھی۔ جن کے مکان میں سے زیورات یا رقمیں برآمد ہوئی انہیں
کچھ ہی ماہ قید رہنا پڑا۔ شہر بدر کر دئے گئے لیکن جن کے مکان
سے ایسی رقمیں حاصل نہ کی جاسکیں۔ انہیں نت نئے شکلات
میں گرفتار ہونا پڑا۔ یہ میرا قیاس ہے اس کی تائید میں مزید
معلومات آئندہ پیش کروں گا۔

خانہ تلاشی کے وقت للتا میرے ایک دوست کے گھر
چلی گئی۔ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو میں بھی للتا سے جا ملا
دس بجے رات تک محفل اجاب میں غپ ٹپ کر کے للتا اور
دیگر اجاب سے رخصت ہو کر اپنے ایک دوست رام بھائی مٹیل
کے ہمراہ پولس اسٹیشن پر گیا۔ رام بھائی کے مکان پر بھی ضبطی کا عمل
ہوا تھا۔ بیچارے کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ وہ بچہ
شکستہ دل تھے۔ چونکہ ان کے مکان سے کچھ زیورات وغیرہ سرکاری
تفتیش کنندوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اس لئے ان کو مزائے قید
یا مشقت کے بجائے صرف شہر بدر ہونے کی زحمت دی گئی۔

۱۳۲
 پولیس انسپکٹر نے فوجی عہدہ دار کو ہم لوگوں کے بارے میں ٹیلیفون
 کیا اور اس کے احکام کی بناء پر ہم دونوں کو جیل میں ڈال دیا گیا،
 جیل میں ہم دونوں کو ایک کبل دیکر الگ الگ دو کمروں میں
 بند کر کے منتقل کیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آگئی۔

دل کو ہوشیار کرنا تو نیند آتی ہے لگاؤ پر
 دوسرے دن تقریباً نو بجے پچیس آدمی کی ایک جماعت مجھس
 میں آئی اور اس نے قیدیوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں اور پاؤں میں
 لہسے کی وزنی زنجیریں ڈال کر پیدل اسٹیشن پر لائی ایک تھرڈ کلاس
 کے ڈبہ میں سب کو بھر دیا۔ ہم کل نو قیدی تھے۔ آئندہ سلاہ واقعات
 کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا مختصر تعارف
 بھی کرا دوں۔

اسیرانِ بلا کا تعارف

(۱) مسٹر کیشو لعل..... ہلکار عدالت عالیہ

بمباسہ۔ آپ ہندو یونین نامی، مذہبی اور سماجی ادارہ کے
 مستند تھے۔

آپ کو اس وقت بیرونی میں ہونے کی وجہ سے منتقل کر کے
 والی لایا گیا۔

(۲) مسٹر بشن داس شرما ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ذمہ دار ہلکار

اور آریہ سماج کے ایک رکن۔

(۳) بابو منشی لال ریلوے کے ذمہ دار گڈس کلرک اور آریہ سماج کے لیڈر

(۴) دھنی رام ایک پنجابی پہلوان بشن داس کے دوست باکل نا خواندہ۔

(۵) رام بھائی ٹیل میری کمپنی کے منجر اور کانگریس کے شریک مستمد۔

ہم سب میں آپ ہی ایک سند یافتہ تھے
(۶) شمشیر شنکر ایک وکیل کے کلرک جنہیں یہ جہز نہیں کہ
سیاسی یا سماجی جدوجہد کس چڑیاکانا نام ہے
(۷) پریم شنکر ایک یورپین تجارتی کمپنی کے اہلکار سمجھی
سیاسیات میں آپ نے دخل نہیں دیا۔

(۸) گوکل داس ایک سید ہے سادھے تاجر ذات کے لوہار
مشر شمشیر شنکر اور پریم شنکر کی طرح آپ بھی سیاسیات یا سماجی
کاموں سے باکل الگ تعلق رہنے والے۔

(۹) ایکٹ خاکسار خانہ بدوش درومند ہندوستانی جس سے
ہمارے قارئین غالباً نا آشنا نہیں۔

مجھے یا رام بھائی ٹیل کو صرف گرفتار کیا جاتا تو خیال کیا
جاسکتا تھا کہ ایک سیاسی ادارہ کے خدشگزار ہیں۔ لیکن یہ سب
باقی اور نا کردہ گناہ لوگوں کو آخر کیوں متلائے مصائب کیا گیا

کیا بے گناہی بھی کوئی مستقل جرم ہے - ؟ جو ناکردہ گناہوں کی سزا
جھیل رہے ہیں -

جملہ حالات پر مدبرانہ نگاہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی
ہے کہ - کوئی مشوق ہے اس پر وہ زنگاری میں - اور صاف ظاہر
ہوتا ہے کہ اس پردے کے پیچھے خود غرض اور کمینہ ہاتھ کار فرما ہے

ہماری گرفتاری سے تقریباً ایک ماہ
مجرم ہاتھ - قبل صنیف نامی پنجابی شخص گاؤں گاؤں

اور گھر گھر بھرتا تھا - یہ شخص پہلے پولیس میں تھا - اس نے میردبی
میں یورپین حدود کے اندر ایک زمین اقرار کے ذریعہ لی تھی -
اس کا نیروبی میں مسٹر گوگل داس کے خاندان والوں سے بھی تعلق
تھا فوجی محکمہ میں اس غدار شخص کو کرایہ پر جا سوسی کے لئے لیا گیا
تھا - میری دانست میں یہ مجرم ہاتھ بھی ناکردہ گناہوں کو گرفتار
کرانے میں شریک تھا -

ہم گاڑی میں تو سوار تھے - چلے
ساوے والے جیل میں جا رہے تھے - لیکن ہمیں یہ نہ
معلوم تھا کہ کہاں جا رہے ہیں - نصف شب گزرنے کے بعد ہم
ایک اسٹیشن پر اتارے گئے بمشکل معلوم ہو سکا کہ یہ واٹے ہے -
ہاں سے پرووٹ مارشل کے دفتر میں ہمیں پہنچایا گیا جس کے
طرف فوجی کیمپ تھا اور اسی میں غاردار تاروں کے وسیع

احاطہ کے وسطی حصہ میں ایک ٹین کی شیڈ گھڑی کی گئی تھی، بیچ میں دفتر اور دفتر کے اطراف جیل کے کمرے۔ شیڈ کے کھلے حصہ میں ہمیں رہنے کے لئے جگہ دی گئی۔ سردی اس بلا کی تھی کہ دانت سے دانت بچتے تھے لیکن ہمیں اور ہفتے کے لئے صرف ایک سوتی چادر دی گئی اور بستر کے لئے صرف زمین جس پر مٹی کا قدرتی

فرش تھا۔ دوسرے دن بطور بستر واک کی ڈوری کی گھڑی دی گئی اس عرصہ میں ہمارا جسم انتہائی گندہ ہو گیا۔ کپڑے غلیظ ہونے اور ان میں جو میں اور پھو بھرتے لیکن مہین غسل کرنے کا موقعہ دیا گیا اور نہ بدلنے کے لئے دوسرے کپڑے دئے گئے۔

ہم نو آدمیوں میں سے مجھے اور مسٹر کیشولال کو ایک کمرہ میں اور مہنی لال و گوگل داس کو دوسرے کمرے میں بند کیا گیا۔

ہم پر پہرہ دینے والے انگلینڈ کی ہمارے پہرہ دار لیسر پارٹی کے کچھ رضا کار رکھے گئے تھے، پیشہ ورسپا ہی نہ تھے، ان میں حجام، دھوبی، اسنار، لوہار، پھیری والے، کولہ کی کان کے مزدور تھے۔ ان میں ایک بھی تعلیم یافتہ شخص نہ تھا مگر پھر بھی رات ہوتے ہی یہ سب لوگ میرے پہلو کے کمرے میں جمع ہونے اور روزمرہ کے واقعات، مذہبی سیاسی اور سماجی امور پر نقد و تبصرہ اور مذاکرہ کرتے ان کی گفتگو سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ انگلینڈ کا بے علم طبقہ بھی ہمارے ہندوستان کے

گر بچو میٹوں سے کہیں اونچے معلومات رکھتے ہے۔

کچھ دن بعد ان پرہ داروں کو بدل دیا گیا۔
اسیران نو دوسرے پرہ دار آگئے ایک دن ۲۵ افراد
 جو دہاں کے مقامی باشندے تھے گرفتار کر کے لایا گیا اور اسی محبس
 میں ان کے لئے بھی گنجائش نکالی گئی۔ ہر ایک کے کمرہ میں ایک ایک دو
 دو آدمی ٹھونسے گئے اور کچھ کھلے میدان میں رکھے گئے۔ ان میں
 سے ایک کو میرے کمرہ میں اور ایک کو کیشو لال کے اور ایک کو منی لال
 کے کمرہ میں بند کیا گیا۔ ان کی زبان ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔

ان غریبوں کو تو بالکل اس کا علم بھی نہ تھا کہ وہ کس جرم
 میں یہاں لائے گئے اور کس گناہ کی پاداش میں یہ سزا جھیل
 رہے ہیں۔

ورانڈے کے قیدیوں کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے جکڑ کر چھت
 سے بانڈھ دئے تھے۔ رفع حاجت کے لئے جاتا ہوتا تو سپا ہی صرف
 پاؤں کی رسی کھولتے تھے۔ اور ان کے ہاتھ کی رسی اپنے ہاتھ
 میں لے کر جانوروں کی طرح پنہکاتے ہوئے یہاں سے نکلتے۔

ایک قیدی کی جرات گول داں کے کمرہ میں رہنے والے
 ایک رات تقریباً آٹھ بجے
 نینگرو نے اطراف میں گئے ہوئے خاردار تاروں کو پھیل کے باہر
 کود پڑا، ستری کے بندوق کی آواز سننے سے قبل وہ بھاگ نکلا،

اس کے جسم کے گوشت کے ٹکڑے تاروں کو لگے ہوئے تھے۔ اس کی اس جہارت سے ہمیں بڑی حیرت اور بڑی خوشی ہوئی لیکن اس فوس اس خوشنودی کے اظہار کا موقعہ نہ مل سکا۔

اس واقعہ کے بعد جملہ ہندوستانی قیدیوں کو بھی رات کو عمل کو سوتے وقت ہتکڑیاں پہنکر سونے کا حکم ہوا جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔

چند روز بعد کچھ اور قیدی لائے گئے، جو کچھ اور اسیران بلا وضع و قطع سے پنجابی معلوم ہوتے تھے۔ یہ لوگ ریلوے انجن کے لئے لکڑی کا گتہ لیا کرتے تھے ان میں رامانند بودھ راج بھی تھے۔ یہ رامانند بودھ راج اینڈیکسٹی کے نام سے یوگانندہ ریلوے کے مختلف اسٹیشنوں پر مکڑی مہیا کرتے تھے، ان کے ملازمین گیش لال ویوگر راج ایک ڈپو پر کام انجام دیتے تھے، اور دوسرے ڈپو پریشن سنگھ اور عمل چند نامی ایک سولہ سال کا لڑکا دونوں ملکر کام کیا کرتے تھے۔ بودھ راج کی عمر ۶۰ سال، اور رامانند کی ۵۰ سال تھی۔ یہ دونوں بہت مالدار بیوپاری تھے اسی اثنا میں سیتارام نامی ایک اسٹین ماسٹر کو گرفتار کر کے لایا گیا یہاں اس امر کی وضاحت ضروری نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اس کی خوش قسمتی سے گرفتار کرنے والے لوگ ملٹری پولیس کے نہیں تھے بلکہ ملٹری اسٹاف کے کارکنان نے اسے گرفتار کیا تھا۔ گرفتار

کے بعد ان کے مکان کی تلاشی لی گئی اور اس میں کوئی ایسی چیز نہ
 نکل سکی جو قانوناً قابل اعتراض ہو۔ فوراً اس نوعیت کی رپورٹ
 پیش کی گئی۔ لیکن پولیس کا گرفتاری میں یہ ظاہر کرنے کا ارادہ
 تھا کہ بیبا سہ میں گرفتار شدہ اشخاص کا تعلق اس شخص کے ساتھ
 تھا۔ لیکن گرفتاری مٹری اسٹاف کے ذریعہ عمل میں آئی تھی۔
 اس لئے پولیس کو اپنے ارادے میں ناکامی ہوئی اس کا آئندہ
 آنے والے واقعات سے بخوبی انکشاف ہوگا۔

ملزموں کا حشر

ایک دن ہم تمام ملزموں کو تھکڑیوں
 ایک خوفناک نظارہ کے ساتھ باہر نکالا گیا۔ اس دن
 خلاف معمول سو بھروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تقریباً دو
 میل چکر ہم رانفل ریچ میں داخل ہوئے۔ سب کو نصف دائرہ
 کی شکل میں کھڑا کیا گیا۔ درمیان میں ایک ستون گڑا ہوا تھا۔
 نیگروں میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر لایا گیا اور اس کے دونوں
 ہاتھ پیچھے کر کے اسی ستون سے باندھ دیئے گئے آنکھوں پر پٹی
 باندھ دی گئی اور اس کے سینہ پر ایک گول کاغذ چپکا دیا گیا۔
 اور تقریباً دس فٹ کے فاصلہ پر (۶۶) سپاہی کھڑے کئے گئے
 جنہوں نے فالو کا حکم پاتے ہی ایک ساتھ گولیاں چلا دیں پھر

پھر سارجنٹ کے لوڈ یعنی بندوق میں کارتوس بھرنے کا حکم دیا
تیسری مرتبہ بھی اس سفاکانہ فعل کا اعادہ ہوا تینوں مرتبہ گویا
مقتول کے سینے کو پار کرتی جوی چلی گئیں۔ ایک کے بجائے
اٹھارہ گولیوں کو چلانے کا مقصد جوش انتقام اور دہشت انگیزی
کے علاوہ شاید یہ ہو کہ یہ شہید کہیں زندہ نہ ہو جائے۔

کہیں سوتے ہیں کیوٹ یہ مجاہد بولے۔ ہیں اسی خوف کو لڑہ برانہ ام حدود
اس خوفناک بیرحمانہ مظاہرے نے

ہمارے دل میں فوجیوں کے خلاف زبردست نفرت کی لہر
دوڑادی۔ اور کچھ لوگ جنہوں نے آرام و آسائش کی زندگی
بسر کی تھی وہ بہت خائف ہو گئے۔ یہ دردناک واقعہ ۱۹۱۵ء
کو پیش آیا۔

سوالیات اور سازشیں
ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۵ء یہ دو مہینے

پیش نہیں آیا نومبر میں لمبا سہ پوس کے چند عہدہ داروں نے
ہم میں سے چند آدمیوں کو الگ الگ کر کے الگ الگ سوالات
کرنے شروع کر دیا۔ مختلف ملازموں سے دریافت کرنے کے بعد
دن کیشولال صاحب کو بلا کر لے گئے اور ان کو ایسا نوٹ بک دکھایا
گیا جس میں کچھ میرے متعلق لکھا گیا تھا۔

یہ نوٹ بک کیشولال صاحب ہی کے مکان میں ملاشی

کے موقع پر ان کے گھر کے سامان میں ملا تھا۔ یہ سامان محمد یوسف کی بیوہ کا تھا جو کیشولال کے یہاں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہتی تھی۔

پولس کی کوشش اس سے پولس کی یہ کوشش تھی کہ کیشولال (جس کا چند ماہ قبل انتقال ہوا ہے) کا ہے جس کی رو سے مجھے تختہ دار پر لٹکانے کی ایک وجہ پیدا ہو جائے اس شہادت کے عوض کیشولال صاحب کو رہا کر دیا جائے لیکن پولس کو اپنا یہ ارادہ صاف صاف ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نوٹ بک سے مراد ایک نعلق تھا اس کا کیشولال کو بھی علم نہ ہو سکا۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں حالات میں پھر تبدیلی ہوئی۔ گنیش لال اور یوگراج کو کورٹ مارشل کرنا قرار پایا۔ یوگراج میرے ہی کمرے میں رہا کرتا تھا اور گنیش لال میرے پہلو کے کمرے میں گنیش لال کو انگریزی آتی تھی۔ یہ دونوں صاحب جس گاؤں میں کلڑی کھڑاتے تھے وہیں ایک یورپین صاحب یہی پیشہ کرتے تھے ان میں آپس میں ہم پیشے کی بنا پر رقابت رہتی تھی۔ کچھ دنوں سے یہ گورے صاحب رضا کار فوجی عہدہ دار اس عہدہ کی وجہ سے راما نند بھڑھراج ایڈیکٹی سے ان کو انتقام لینے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا۔ چونکہ دشمن کے حملہ ہمیشہ ریلوے راستوں پر ہوا

کرتے تھے۔ دشمنوں کو اشیائے خوردنی فراہم کرنے کا الزام ان لوگوں پر عاید کیا گیا اور واقعہ یہ تھا یوگرانج اور گنیش سہل یہ ہمیشہ ریلوے لائن ہی پر رہا کرتے تھے مگر اس لائن کی پوری نگرانی ہماری مرہٹہ پلٹن کیا کرتی تھی۔ یوگرانج باورچی کا کام بھی بہترین جانتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ان سپاہیوں کے کھانا پکانے کا انتظام کر دیتے تھے۔ کیا ستم تھا کہ وہ خدمت سرکاری سپاہیوں کی کریں۔ امداد اپنی فوج کی کرتے تھے۔ اور الزام دشمن کی اعانت کا عاید کیا جائے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا اور جنوں کا خرد
جو چاہے پکا حسن کر شمشاد ساز کرے

کورٹ مارشل کا فیصلہ

دہی قاتل وہی منصف، وہی شاید ٹیڑھے

صبح کے ۹ بجے پروسٹ مارشل کیجھرال آفس میں آئے اور آتے ہی ہمیں جگایا اور گنیش لال اور یوگرانج کو اپنے کمرہ میں بلوایا۔ بشن داس ٹرما کو بھی انگریزی کا ہندی میں ترجمہ کرانے کے لئے طلب کیا گیا۔ کمرہ میں داخل ہونے پر فیصلہ سنا با گیا۔ کورٹ مارشل نے

۱۵۲
 نے گنیش لال اور یوگراج کو گولی مارنے کا حکم دیا ہے جس کی
 فوری تعمیل کے انتظامات ہو رہے ہیں۔

گنیش لال اور یوگراج نے اس فیصلہ کو انتہائی خندہ پیشانی
 سے سنا دیا، بھر مجھے تشویش رہی لیکن گنیش لال اور یوگراج
 بالکل مطمئن تھے ان کے چہرے سے استقلال اور بہادری
 نظر آرہی تھی، اٹنے اٹنے وہ ہمیں کو دلاسا اور تسلی دے رہے تھے۔
 یوگراج نے ایک آٹے کا چراغ تیار کیا۔ اور اسے نمکا
 کر کے آنے والی مصیبت کا مردانہ دارمقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا
 اور گنیش لال نے اپنے کمرہ میں بیٹھ کر ایک غزل بعنوان جلا د
 کی تلو اور گائی جس کی آواز آج تک میرے کانوں میں گونج
 رہی ہے صبح سات بجے ہماری تھکڑیاں کھول دی گئیں اور ہم کو
 موقعہ دیا گیا کہ ان بہادروں سے ملاقات کریں۔

واہ رے فوق شہادت کوئے قاتل کی نظر

قص کرتا گنگنا، جھومتا جاتا ہوں میں

اس کے بعد ان لوگوں کو قتل کی طرف لجا یا گیا۔ یوگراج
 اور گنیش لال قتل کی طرف چل نہیں رہے تھے بلکہ دوڑ رہے تھے
 ان کی رفتار کے سبب سپاہیوں کو بھی اپنی رفتار تیز کرنی پڑی
 قتل میں پہنچ کر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حکم دیا گیا لیکن
 انہوں نے اپنی جوان مردی کی توہین سمجھتے ہوئے اس سے صاف

انکار کر دیا اور یہی ان کے لئے موزوں تھا۔ لوڈ اور فیر کے آرڈر کے ساتھ ہی بہادروں کی زبان سے انکار کی آخری صدا بلند ہوئی جو فضا میں پھیلی اور ان کی پاکیزہ اور معصوم روح کے ساتھ ملکر بہشت بریں کو پرواز کر گئی۔ دو بارہ سے بارہ گولیاں چلائی گئیں۔ - ۵ -

وہی قاتل، وہی شاہد وہی منصف کبھی

اترے میرے کرے خون کا دعویٰ کس پر

کیپ پر واپس آنے کے بعد ہم پر کیا جیتی اس کا اندازہ نہیں
خود اپنے حساس قلب سے کر سکتے ہیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۱۵ء پر دولت مارشل نے مجھے اور کیشوال

کو بلا یا تھا۔ یکم اگست ۱۹۱۵ء کی دوپہر کو ہم لوگ دائی لائے تھے۔

۶ اگست کو کیشوال نے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لئے حسب

ذیل درخواست کھی اور پر دولت کو دی کہ بذریعہ تار روانہ

کر دے مگر اس نے صاف انکار کیا۔ -

تاریخ گورنر

تاسا :- بشرف ملاحظہ عالیجناب گورنر صاحب مائردہی۔

مثنیٰ :- بخدمت جناب چیف جسٹس صاحب بیہاسہ

متعدد سر آدردہ لاگوں کو فوجی آفسروں نے گرفتار

کر کے پانچ دن سے مقفل کر رکھا ہے جن کی رہائش و آسائش کا کوئی بند و بست اب تک نہیں کیا گیا۔ سنڈی میں عدالت سیول سے تحقیقات کرائی جائے۔ ”گیشول“

ان واقعات سے ہم بہت ہی خائف ہو گئے ہماری حالت تھی، ہمارے دلوں پر اسی چھا گئی تھی۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمیں بھی گنیش لال اور یوگراج کی طرح ایک نہ ایک دن جام شہادت پینیا پڑے گا۔

اس اثنا میں لیشن سنگھ اور لعل چند کے ساتھ بھی کورٹ مارشل نے وہی سلوک کیا جس کے تصور ہی سے آدھی جان نکل جاتی ہے۔

شام کے وقت پروولسٹ مارشل نے مجھے ہم کو نمرائے موت اور کیشولال کو طلب کر کے فیصلہ سنایا کہ ایک ہفتہ بعد ہم پر بھی کورٹ مارشل کیا جائے گا۔

کیشولال نے ہمت کر کے وجہ دریافت کی، الزام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے ثبوت کے بعد ۲ سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا نمرائے قتل سے

ناوک نے تیرے جید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس فیصلہ کے سنتے ہی ہمارے جسم میں خون نہ رہا کیشولال

کو تو غش آگیا۔ زمین پر گرنے ہی والے تھے کہ میں بڑھ کر تھام لیا سے

نشہ پلا کے گراناتا تو سب کو آتا ہے

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام ساقی

ڈاکٹر بلایا گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کے رہین منت
ہوں خود ہی ہوش میں آگئے اور ہمیں اپنے مقام پر بھیج دیا گیا۔

تختہ دار

پچاسی کی سنرا - بودھراج تقریباً ۶۰ سال کا ضعیف العمر شخص
تھا سے چند رہ تازیانہ کی سزا دے کر رہا
کر دیا گیا۔ شن سنگھ دلال چند کو بھی اسی ہفتے کورٹ مارشل کیا گیا۔
ان پر دشمن سے ملکر یوگانڈا ریلوے لائن اکھاڑنے میں مدد
کر نکالنا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ۵۰۰ میل لمبی یوگانڈا ریلوے لائن
دشمن کی سرحد سے بالکل ملحق تھی اتنی لمبی لائن پر دشمن کے دو
چار آدمی رات میں کسی ایک مقام پر آ کر ایک ایک فٹ کے
گرٹھے کھودتے اور ان میں بم رکھ کر لائن آسانی سے اڑا دیا کرتے
تھے معلوم نہیں دشمن کو اس کام کے لئے شن سنگھ وغیرہ جیسے آدمیوں
کی کیا ضرورت تھی۔ اسے فرنگی ارباب فراست ہی سمجھ سکتے ہیں
یوگانڈا ریلوے کو بکڑی کی سربراہی کو کے کسی نہ کسی طرح اپنی
روزی کمانے والے عزیز و محبوب کو ان امور سے کیا سروکار ہے
خیر عدالت میں ان کے خلاف جو شہادت پیش ہوئی صرف

اس قدر تھی کہ ایک دن ریلوے لائن پر بم پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ شن سنگھ کے مزدوروں نے بم پھٹنے کے مقام پر جانے کی اجازت چاہی لیکن شن سنگھ نے اجازت نہیں دی۔ شن سنگھ نے عدالت کے سامنے اس کا اقرار کیا اس کے ساتھ ہی تازہ جاری کردہ فوجی گشتی پیش کی گئی جس میں یہ درج تھا کہ جو کوئی آدمی شام کے چار بجے سے دوسرے دن کی صبح تک ریلوے لائن پر نظر آئیگا اس کو گولی مار دی جائے گی۔ وہاں کے پروولٹ مارشل نے رامانند سے کہا کہ شن سنگھ نے اپنی تائید میں جو شہادت اور صفائی پیش کی ہے وہ بالکل واضح صاف اور غیر مبہم ہے اس سے ثبوت ملتا ہے کہ اس نے دشمن کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ فوجی حکم کی تعمیل کی ہے۔

۳ دسمبر کو شن سنگھ، رامانند، دلاپنڈ پر چلایا گیا اور ۵ دسمبر کو مجھ پر اور کیشو لال پر مقدمہ چلایا گیا۔ ہماری طرف سے صفائی کے لئے نیروجی کے مشہور و قابل بیرٹرمسٹر کرکیول آئے تھے۔

قارئین کو معلوم ہو گا کہ اس مضمون کے ابتداء، **جاسوس کا پتہ** میں میں نے محمد یوسف کا تذکرہ کیا تھا آئے

اس ذات شریف کی مزید نقاب کشائی کریں تقریباً دس سال کے بعد محمد یوسف ۱۹۱۳ء میں مجھ سے پھر بھلا سہ میں آکر ملا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد اس کی بیوی نے اس سے خلع حاصل کر کے کسی دوسرے

مسلمان شادی کر لی تھی۔ پھر نہ جانے کس طرح دوبارہ اسی محمد یوسف کے دام زوجیت میں پھنس گئی۔ اس وقت اس کے آنے کا مقصد مجھ سے مدد طلب کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اُسے اپنے دفتر میں کوئی ملازمت دے دوں گا۔

میرا دفتر تعلق انڈین ایسوسی ایشن اور کانگریس سے تھا۔ اس لئے یہاں بھی کچھ نہ کچھ سیاسی گفتگو چھڑ ہی جاتی تھی۔

فوجی لوگ رخصت اور فرصت کے اوقات میں آیا کرتے اور دفتر میں بیٹھا کرتے تھے اکثر لوگ گفتگو ہندوستانی اور گورے سپاہیوں کے باہمی تعلقات اور امتیاز پر ہوا کرتی تھی، مثلاً یہ کہ کالے اور گورے کا یہ فرق کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ کالوں کو گوروں کی طرح انسان کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ محمد یوسف جن کا ہمیں تعارف منظور ہے۔ سر پر پٹی باندھے ہوئے آیا۔ دریافت پر کہنے لگا کہ کسی بد معاش نے اندھیرے میں رات کو لاٹھی سے مارا ہے اُس کی نخیف و پردرد آداز سے معلوم ہوتا تھا کہ زخم کاری ہے۔ میں نے اظہارِ ہمدردی کے لئے اُسے کہا کہ جب تک زخم مندمل نہ ہو جائے آرام کرو، مگر وہ چلا گیا چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ محمد یوسف اسی زخم کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسا۔ اور اس کی بیوی کا سر رشتہ کروڑ گیری

میں ہندوستانی متورات کی جھڑپ کی کام پر تقرر کیا گیا ہے۔ اور بمبائے میں کیشو لال نے اپنے مکان کا ایک خالی کمرہ اس کے پچھلے واقعات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس کو رہائش کے لئے دیا ہے۔ کیشو لال کے مکان کی جب تلاشی لی گئی تو عورت کے کمرہ کی بھی تلاشی لی گئی۔ اس تلاشی میں ایک نوٹ بک جس میں میرے اور بعض دیگر کارکنوں کے متعلق کچھ نوٹ لکھے ہوئے دستیاب ہوئی خاکسار کے متعلق تحریر تھا کہ میں آج ساؤکے کے دفتر کو گیا تھا۔ وہاں سارے سرکاری سپاہیوں کو ورغلاتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کیا جاتا نیز یہ بھی کہہ رہے تھے۔ کہ اگر ترکستان جرمنوں کو مل جائے تو ہندی مسلمان ترکستان کے خلاف لڑنے پر آمادہ نہ ہوں گے وغیرہ اس سے ظاہر ہے کہ محمد یوسف نے اپنے ذاتی اغراض یعنی سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے میرے خلاف جاسوسی کا کام انجام دیا تاکہ انگریزوں کو اس سے ہمدردی ہو جائے۔

اس نوٹ بک کو میرے خلاف عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت محمد یوسف خود اپنے کمرے کی سزا پانے کے لئے جہنم رسید ہو چکا تھا۔ اور ملٹری اسٹاف بطور شاہد عدالت میں اسے پیش کرنے سے قاصر تھی۔ قابل اذخالی شہادت نہیں

قرار ہونے دیا۔ اور عدالت کو مجبوراً تسلیم ہی کرنا پڑا۔ ورنہ میرے قتل کئے جانے لے مزید مواد کی ذرا بھی ضرورت نہ رہی تھی۔

رسیدہ بودہ لے ولے بخیر گذشت

کورٹ مارشل کی تحقیقات دو گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ شام کے پانچ بجے مجھے اور کیشو لال پر پھر دو لٹ مارشل کے کمرہ میں بلایا گیا یہاں پر ولے کے کمانڈر جنرل سیلین خود موجود تھے۔ انہوں نے کورٹ مارشل کا فیصلہ پڑھ کر سنایا۔

تم پسر کار کے خلاف جدوجہد کرنے کا الزام ثابت فیصلہ ہوا اور کیشو لال پر قابل اعتراض کتب رکھنے کا الزام ثابت ہے۔ اور اس الزام میں تم دونوں کے لئے سزائے قتل تجویز کی جاتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ترغیب و ترہیب سے کام لیتے ہوئے یہ عذرانہ تجویز ہمارے سامنے پیش کی سینا رام نام کا ملزم جو تم میں بہت ہی بد معاش اور شیطان سیرت ہے اس پر حرم ثابت کرنے کے لئے ہمیں ثبوت کی ضرورت ہے۔ اگر تم لوگوں نے اس کے خلاف شہادت دی تو نہ صرف تمہیں جان بخشی دی جائے گی۔ بلکہ تمہاری آزادی تم کو واپس دی جائے گی۔ کورٹ مارشل کے فیصلہ پر فوراً عمل ہونا ہے لیکن میں تمہیں ۲۲ گھنٹوں کی مزید ہمت دیتا ہوں خوب سوچ لو ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مجھے

بیاختہ ہستی آگئی اور جب کبھی یہ فیصلہ یاد آجاتا ہے تو اب بھی مسکراہٹ میرے لبوں پر کھیل جاتی ہے۔ ستینارام اور ہم میں ارتباط پیدا کرنے کے متعلق جو کارروائی عمل میں آئی ہے وہ ذرا تفصیل طلب ہے عرض کرتا ہوں ذرا سنئے۔

بیمارہ میں ہمارے ساتھ گرفتار ہونے والے جملہ اشخاص کی خانہ تلاشی کے سلسلے میں تمام کاغذات ضبط کرنے گئے لیکن ان میں ہمارے خلاف کوئی مواد حاصل نہ ہوا۔ اس لئے ہم جملہ اشخاص کا نام دینے والے شخص کو کچھ نہ کچھ مواد فراہم کرنا ضروری تھا۔ اس خانہ تلاشی کے چار ہفتہ بعد ضبط کردہ کاغذات میں ایک ٹائپ شدہ کاغذ جس کے نیچے ستینارام لکھا ہوا تھا ملا۔ اس قسم کی شہادت پولس کی جانب سے پیش ہوئی۔ دائرے جیل میں آنے سے قبل ہم نے ستینارام کو جواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پراسیکیوشن کی جانب سے جو شہادت پیش ہوئی تھی اس میں بیان کیا گیا کہ یہ خط فلیکپ سائز پر ٹائپ کیا گیا تھا۔

جب وہ ملا تو معلوم ہوا کہ اس خط کو لغافے میں رکھنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے فوراً نہیں رکھا جاسکا۔ اس خط کا مضمون یہ بتلایا گیا۔

ستینارام فوج میں برطانوی سرکار کے خلاف بغاوت پھیلا

ہے۔ اس خط میں ”ہم بھولانا تھ“ لفظ کہا ہوا پایا گیا۔ سیتارام نے یہ عجب سے ظاہر کیا تھا کہ جاسوسی کے سلسلے میں یہ لفظ حنیف کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط تیار کر کے ہمارے سامان میں چھپا کر رکہ دینے کا کام اسی بد معاش حنیف نے کیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ حنیف نامی ایک بد معاش ہے جسے سررشتہ فوج نے شہر بدر کر دیا ہے مذکورہ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مشرمیلین ہکو سیتارام کے خلاف شہادت دینے کے لئے کیوں مجبور کر رہے تھے۔ سیتارام کو ملٹری اسٹا کے عہدہ دار نے گرفتار کر کے اسی وقت اس کے مکان کی تلاشی بھی لے لی تھی اور رپورٹ میں کہہ دیا تھا کہ کوئی لائق اعتراض چیز نہیں پائی گئی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ سیتارام کے خلاف کوئی نیا مواد فراہم کیا جائے جس سے اس کو اچھی طرح سنایا جاسکے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان ۲۴ گھنٹوں ہمارا حال میں ہمارا کیا حال ہوا کیا بتاؤں جس شخص کو ہم نے دیکھا بھی نہیں اس کو بلا تصور موت کے منہ میں دیکر خود بچ جانا انسانیت کے خلاف تھا۔ اس لئے یقین ہو گیا کہ اب پھانسی قریب ہے اس کے بعد خیال آیا کہ جب جان جانی ہے تو ان کے ہاتھ کیوں جائے اور خود کشی کر کے خود کیوں نہ ختم ہوجاؤں خود کشی کے لئے جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے اتفاقاً

سے موجود تھا لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح مرنے کے بعد لوگ مجھے بزدل کہیں گے۔ ظلم ظالم کے ہاتھوں ہی ظاہر ہو تو بہتر ہے ہلکو نر سنانے کے بعد لاچند کو پھانسی کی سزا سنائی گئی رانا نند کو رہا کیا گیا۔ بش سنگھ کو بلا یا ہی نہ گیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے دفتر میں جہاں تین فوجی عہدہ دار اور بیچ میں پردو مارشل بیٹھا ہوا تھا وہاں نے گئے اور وہاں ہم سے پھر دریافت کیا گیا کہ کیا سیتا رام کے خلاف بیان دینا ہے ہم نے کہا کورٹ میں بیان دے چکے ہیں ہماری جانب سے اس میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آرڈر سنایا گیا ہمیں پھانسی دینے کے لئے **موت ملتوی**۔
بہا سہ بھیجا جائے۔ آج کی موت کل پرز

مل گئی۔ اس مبارک موقع پر میں نے باورچی سے آخری دعوت کے لئے کہا جو منظور کر لی گئی۔ شیر پوری اور بھاجی تیار کی گئی خوب اطمینان سے ہم نے کھانا کھایا نوبے شب کو پرودا ملٹ مارشل کے ایک یورپین سارجنٹ کے ایک اہلکار نے ہم چاروں کو ایک ہندی پلٹن کے حوالدار کے حوالے کیا اور کہا کہ یہ ہندوئی تھے لیف لوگ ہیں ان کو تھکڑی وغیرہ نہ پہنائی جائے لیکن سیفارش کا رگہ نہ ہوئی۔ اور ہم اسی شان سے لائے گئے۔

ہم پر تقریباً دو ماہ یورپین سپاہیوں کا اور دوسرے

دو ماہ ماہ ہندی سپاہیوں کا پہرا تھا۔ یورپین سپاہی آزاد
 ماحول میں پلا ہوا ہونے کی وجہ سے ہم سے ہمدردی سے پیش
 آتا لیکن یہ برادران یوسف ہمارے لئے سید تخلص دہ ثابت
 ہوئے ہمیں پھانسی کی سزا کا حکم ہوتے ہی یہ ہندوستانی سپاہی
 پیشاب پھانے کے لئے بھی تہکڑیاں ڈاکر لے جاتے تھے۔ اس سختی
 کا حکم ان کو حکام بالا سے نہیں بدلتا تھا۔ مگر لشہ غلامی کی حدت اس
 درجے کو پہنچی ہوئی تھی اسی کا یہ اثر تھا۔

بچارہ لاپھند کس ہونے کی وجہ سے گھبرا یا ہوا تھا۔ شن سنگھ
 کا خیال تھا کہ اسے شہر بدر کیا جائیگا۔ ہکو اب کسی بات کا علم
 یا فکر نہ تھی بالکل مطمئن، ہشاش بشاش تھے۔ ٹرین میں ہم لوگوں
 نے ہنکراؤ رکھا کر وقت کاٹا۔ دوسرے دن صبح کو تقریباً دس بجے
 بمبائے اسٹیشن پر پہنچے ہمارے استقبال کے لئے کمانڈنگ آفسر
 بذیہ تشریف لائے ہوئے تھے ہمارا جلوس پیدل ہی تہکڑیوں سمیت
 نکلا گیا گاؤں میں سنسی پھیل گئی۔ سگاؤں کے وسط میں پھانسی کا
 ستون گاڑنے کا کام شروع ہو گیا۔

جیل میں جیل پھینچنے کے بعد ہم چاروں کی تہکڑیاں نکال کر
 جیل کے صحن میں کھڑا کیا گیا۔ شن سنگھ کو ایک طرف
 لے گئے۔ کمانڈنگ آفسر نے کہا ہم تینوں کو پھانسی کی سزا ہوئی
 ہے اور اس کا مراع ممکن نہیں ہم نے استہ عامی کہ پھانسی ہکو

بخوشی قبول ہے لیکن ہکو قتل گماہ تک پہنچنے کے لئے اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دی جائے۔ خوش قسمتی سے اس کی اجازت مل گئی۔ پھانسی سے قبل رکھے جانے والے کمروں میں ہم تینوں کو بند کر کے منقل کیا گیا۔ میرے اور کیشو لال کے کمرہ کی کھڑکی میں سلاخیں تھیں جن میں سے باہر جیل کی صحن کا نظارہ کرتے رہے۔ اولاً کپڑے بدلے بھوک بہت محسوس ہو رہی ہے چپاٹی اور دال دی گئی جیسے گھایا پھر بھی بھوک کم نہ ہوئی ہم نے اور چینا تیاں طلب کیں باورچی نے کہا چپاٹی اور دال سب حساب سے پکی ہیں اس سے زیادتی کی گنجائش نہیں میں نے کہا جیل سے کہہ کر اور گیہوں ولوادوں گا۔ بھوکے رہ کر پھانسی پر جانے کے مقابلے شکم سیر ہو کر جان دینا بہر حال بہتر ہے۔ بیل اور بکری کو بھی ذبح کیا جاتا ہے تو ذبح سے پہلے کھلایا پلایا جاتا ہے۔ ہم تو انسان ہیں۔ یہ سن کر اس نے ہم کو اور کھانا دیا اور ہم نے خوب پیٹ بہر کر کہا یا۔

مطالعہ کتاب جیل میں وقت نہ کٹنے کی وجہ سے کچھ کتابیں مطالعہ کے لئے طلب کیں۔ بابیل اور گیتا بھی گئیں۔ یہ قصہ پڑھ کر کہ حضرت مسیح کو بھی نزلے قتل بھگتنی پڑی۔ مجھے اپنے آئینہ واقع ہونے والے قصہ قتل کی یاد آگئی۔ گیتا میں یہ دوبارہ پڑھا کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے اس فقرہ نے میرے دل کی جرات میں اضافہ کیا۔

ایک دن اسی طرح گزر گیا ”باہر کیا ہو رہا ہے ہمیں کچھ نہیں معلوم باورچی نے کھانا دینے کے بعد کہا کہ آج بشن سنگہ کو قہر کے بیچ کھلے طور پر پھانسی دی گئی۔ اور ہم کو بھی یکے بعد دیگرے دی جائے گی۔ بشن سنگہ کا یہ انجام سنگہ بہت رنج ہوا لیکن اس حادثے کی خبر نے میرے دل کو مطلق کمزور نہیں کیا۔

دو دن گزر گئے تب میں نے جیلر کو بلا کر کہا کہ انگریزی قانون کی رو سے واجب القتل مجرم کو پھانسی دینے میں بلاوجہ تاخیر کرنا اور اسے روحی و قلبی تشویش و اضطراب کے سپرد رکھنا ممنوع ہے۔ مجھے موت کے انتظار کے لئے کیوں وقف کر دیا گیا ہے۔ میرے لئے اس انتظار کی تکلیف موت کی تکلیف سے بدمذہب زیادہ ہے

اے مرگ ناگہاں تیری غیرت کو کیا ہوا

کیوں انتظار تیخ ستم کر رہا ہوں میں

پھانسی کے لئے اس قدر مضطرب دیکھ کر میرے خیال میں اسے یہ محسوس ہوا کہ ہمیں دی ہوئی سزا انسانیت کے خلاف ہے اس نے انتہائی ادب سے کہا کہ میں سیول حکومت کا جیلر ہوں تمہارا متعلق کوئی حکم میرے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو فوجی حکام کو ابھی مطلع کئے دیتا ہوں۔ چوتھا دن نکلا تو خوشی میں کٹا کھانا توجیل کا تھا لیکن بھلا لگتا تھا۔ جو کچھ ملتا تھا کھاتا اور زیادہ بھی طلب کرتا تھا۔ چوتھے دن صبح کانڈرافٹر کی آمد

کسی اطلاع دی گئی۔ میں سمجھا پھانسی کا حکم لائے ہوں گے اس لئے
 اٹینان سے کپڑے بدلنے لگا آئینہ دیکھ کر مانگ نکالی پھر ایک
 آدمی آ کر کہنے لگا صاحب انتظار فرما رہے ہیں میں نے کہا لباس
 پہن رہا ہوں صا۔ ب کو بہت جلدی ہے تو انھیں خود آنے کے لئے
 کہ دو۔ جب میں لباس با طینان پہن چکا تو صاحب کے روبرو
 اپنے مستقبل کو سننے کے لئے آکھڑا بیو گیا۔ کہ اُن کی زبان میرے لئے
 کیا فیصلہ سناتی ہے۔

ربانی

ہندوستان کو واپسی

بسیالہ مرگِ مسلسل

میری ربانی بھی، عجیب حیران آفرین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت کی کار فرمائی مسلم ہے دفتری حکومت کے کل پرزوں نے گو میری شمع حیات کو گل کر دینا چاہا۔ مگر قصا و قدر کا فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہی ہوا اور ظاہر ہے کہ ماویٰ حکومتیں، حکومت ربانی کے مقابلہ میں کبھی کیا سکتی ہیں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ واقعہ یہ ہوا کہ کمانڈرنگ آفسر کے سامنے ہم سب کی طلبی ہوئی۔ میں کیشو لال اور لال چند ایک قطار میں اُس کے سامنے کھڑے ہوئے گئے اس وقت ہم سب اس کی جنبش لب کے تماشا بن گئے تھے۔ کہ اس کا زمانہ سے

کیا نکلتا ہے اتنے میں اُس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا
ایک خاص انداز سے اُس نے ہم لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر کاغذ کو
پڑھ کر سنایا۔ جس میں تحریر تھا۔

”حسب الحکم جنرل کمانڈنگ آفٹر میٹر سادے
اور کپٹولال کی نرائے قتل منوخی کی جاتی
اس کے بجائے، بیس سال کی نرائے با مشقت
دی جاتی ہے۔“

جب یہ کلمات میرے کانوں میں پڑے تو گویا ایسا معلوم ہوا
کہ سو ہفتہ کی شدت سے میرا تمام جسم ایک قد آدم شعلے کی شکل میں
تبدیل ہو گیا ہے۔ نرائے قتل منوخی..... بیس سال کی قید
با مشقت..... گویا ایک مرگ مسلسل..... ایک موت متواتر
..... اس نام و نہاد مقید و مجبور زندگی سے، قتل ہو جانا کہیں خوشگوار
تھا۔ بیس سال تک گھٹ گھٹ کر مرنے رہتا..... اور پھر نہ مر سکا
الامان۔ کس درجہ المناک اور صبر آزما ہے۔ میرے دل دو مانع
میں مختلف خیالات کے شورش افزا طوفان بپا ہو گئے۔ میرے
حواس پر برقی سی کوند گئی۔ میں نے اس عالم طیش میں آ کر کمانڈنگ
افیس سے کہا۔ کہ: ”مجھے یہ سن کر کہ قتل کی سزا بیس سال میں تبدیل
ہو گئی مطلق کوئی خوش نہیں ہوئی۔ اور نہ میں آپ کے اس فیصلہ
کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ اس پر شکر یہ ادا کروں..... میں یہ کہہ

رہا تھا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کہا :-

جناب یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں تو اوپر کے آئے ہوئے حکم کو صرف سادینے کا فرض ادا کر رہا ہوں۔

جیل کی زندگی

جیلر کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہم نے اپنا لباس اتار کر جیل کا لباس پہن لیا۔ اس طرح ہم لوگ گشتی دگردن زدنی مجرموں کی حیثیت سے دفعۃً بہت سالہ قیدیوں میں آگئے۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مسٹر ٹرمر کو بھی وائس سے یہاں لے آیا گیا۔ ملتان میں رام اُس کا جانی دوست، اور رازدار رفیق تھا، مگر حکومت کے دباؤ کار یوں نے اُسے اپنے دوست کے خلاف (سرکاری گواہ کی حیثیت سے) شہادت دینے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ملتان میں رام نے برسر عدالت گواہی دی کہ مسٹر ٹرمر حکومت کے باغی ہیں اور انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت انگیز تقریریں کی ہیں۔

ملتان میں رام اپنے دوست کو پھنسا کر سرکاری جہر باقی سے رہا ہو گیا۔ کیونکہ اس حکومت میں ساری رعایتیں ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جو اپنے ملک و خادمان ملک کے ساتھ انتہائی نامہربانی سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے قیام وائے کے زمانے میں
چند شہیدانِ ہند ۹ چنڈا اور مظلوم نھے جن کو حکومت
کے مذاق شگرمی نے اپنی دپپیون کے لئے مقرب کیا تھا۔ ان میں
سے زنجار کے ایک مشہور خوجہ تاجر علی دینا دھالا بھی تھے،
جن کو گتہ بے گناہی، کی پاداش میں نہایت بے دردی کے
ساتھ پھانسی دی گئی تھی۔

ایک عرب دولتمند بانا بکاری اور ان کے بھائی کو جو
سید شریف اور امن پسند طبیعت رکھتے تھے، بیٹا سہ جیل میں۔۔۔
لایا گیا تھا۔ تاکہ اپنی دس سال کی طویل مدت قید کو یہاں سے
کاٹیں اسی عرب کے دوسرے بھائی کو حکومت کی تیغ جھانے ہمیشہ
کے لئے بار حیات سے سبکدوش کر دیا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
ان دقتزی حکومت کے گورے کار پر دازوں کا مقصد یہ
تھا کہ وہ مرکزی حکومت کے اعضاء اور اکین پر یہ واضح کر دیں کہ
بناوت کے جراثیم اس طرح پھیل گئے ہیں کہ آب ان پر قابو نہیں
مائل کیا جاسکتا اور ہم ان کے طوفان بناوت کو دبانے کے لئے ہر
نوع کی ریادتی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام زیادتی یہ
تمام ظلم و تعدی بے سود ہی ثابت ہوئی کیونکہ یوگنڈہ ریلوے کی
تباہی و بربادی میں دشمن کے جو ملے روز افزوں بڑھتے ہی گئے۔ اور
اس کے حملے براتب تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ بالآخر ہندوستانی

فوجی عہدہ داروں کے ہاتھوں سے مشرقی افریقہ کی جنگ کی
 کمان لے لی گئی۔ اور یہ خدمت جنوبی افریقہ کے محکمہ فوج کے سپرد کی
 گئی۔ جنوبی افریقہ کے ذمہ دار فوجی افسروں نے حکمت عملی میں نمایاں
 تسمد پٹی کر دی۔ یعنی ہندوستانیوں اور عربوں کو خواہ مخواہ گرفتار
 کرنے۔ مزادینے اور پھانسی دینے کا شغل ایک سخت ترک کر دیا۔ اور
 کچھ دنوں کے بعد وائے کے گرفتار شدہ تمام قیدیوں کو ہندوستان
 روانہ کر دیا ان میں ستیا رام بھی تھے۔

آریہ سماج کے لیڈر بابو ہنسی لال اور مسٹر ٹیل اور دیگر شخصیات
 کا سامان بکن حکومت ضبط کر لیا گیا تھا اس سامان میں علاوہ دیگر
 اشیاء کے نقد رقم اور نقروں و طلائی زیور بھی تھے۔ کیشو مل زیور
 کو زمین میں دفن کر چکے تھے اس لئے سرکاری عمال کے ہاتھ کچھ نہ
 لگا۔ اب رہ گیا میں۔ میرے پاس تھا ہی کیا؟

ہندستان کے پرزہ کو روکنے کا منظم

ہندوستانی سپاہیوں پر

ہندوستان کے آب و دانے سے پلے ہوئے اور ہندوستان ہی کی نعمتوں سے متمتع ہو کر داورجیات دینے والے گویوں نے نوع بنوع ظلم کئے۔ بلکہ ان کی شقاوت نے ان غریب سپاہیوں کو بھی نشانہ جو رہنے میں ذرا بھی کمی نہیں کی جو مجبور سپاہی تھے اور جن کا سب سے بڑا جرم انگریزوں کو کچھ ہو سکتا تھا تو طرف یہی کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ ان پر ظلم کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بہانہ چاہئے تو کسی پر یہ الزام لگایا کہ یہ لڑائی میں بزدل ہے کسی پر یہ کہ اس نے اپنے آپ کو خود زخمی کر لیا ہے۔ کسی پر کہ اس نے اپنے کمانڈر

کے خلاف فلان بات کہی۔ رنگ رنگ کے الزامات، طرح طرح کی تمہیں لگانے میں ان کو خوف خدا تو کیا ہوتا۔ انسانیت کی ٹرم بھی اس نہ کرتی۔ ”ان خود غا پیکر وہ“ بے اصل الزامات کی پاداش میں کسی کو دس برس کسی کو ۴ برس کسی کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ ان بے گناہ قصور داروں سے بجا سہیل بھر دیا گیا ہے اور بعض کو قید و بند کے مصائب جھیلنے کے لئے ہندوستان بھیجا

بانا بکاری عرب قیدی کی
 وغیرہ کے خلاف سرکاری
 رہائی اور اسکے بھائی کی موت گواہ کی حیثیت سے شہادت
 دی تھی اس نے نئی فوج کے ذمہ دار حکام کے سامنے جا کر یہ اقرار
 کیا کہ میری جس شہادت کی بنا پر بانا بکاری وغیرہ کو مراد دی گئی۔ وہ
 شہادت قطعی چھوٹی اور بے اصل ہے مجھ سے یہ شہادت بہ جبر
 اکراہ دلائی گئی۔ حکام نے یہ سکر اس کو گرفتار کر لیا مگر بانا بکاری
 کو رہا کر دیا۔ مگر اس قسم کی چھوٹی شہادتوں کی بنا پر جن دوسرے
 ناگروہ گناہ گار و نکو گرفتار کر کے زندان کے ہولناک مصائب
 کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ ان کی کچھ بھی تلافی نہیں کی گئی۔ بانا
 بکاری کی رہائی سے کچھ زمانہ قبل اس کا بھائی جو بہت ہی
 کمزور و نحیف تھا اور جیل کی شدتیں زیادہ دنوں تک برداشت
 نہ کر سکا تھا۔ بیمار ہو کر قید زندگی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا،

ہماری گرفتاری کے بعد ہندوستانی مسٹر بھیسے کے کروت تجارت پیشہ اشخاص سرکاری منظم سے ہراسان و ترسان ہو گئے اور ہر لحظہ انتہائی خوف و دہشت کے ساتھ منتظر رہنے لگے کہ اب ہم پر کیا بلا نازل کی جاتی ہے۔ اور کالی جیہوق پر کیا آفت ڈھائی جاتی ہے۔ اُن کے اس خوف سے فوج کے خفیہ ڈپارٹمنٹ نے فائدہ اٹھایا۔ خاص کر مسٹر بھیسے نے تو وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ان صاحب نے ہموطنی اور وطن پرستی کا خوب ہی حق ادا کیا۔ یہ فرماتے تھے کہ میں مہار شٹر کار، والاہوں خاص ہندوستانی ہوں۔ مگر ہندوستان کی محبت و احترام کا یہ حال تھا کہ وہ ہر ہندوستانی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیا کرتے کہ تمہارا نام بھی ملٹری میں دے دو گنا تمہارا شمار سرکار کے خلاف باغیوں میں کر اگر سخت سے سخت سزاؤں لگاؤں گا۔ تمہارا حشر بھی وہی کراؤں گا جو اس وقت ساولے اور کیشولیل کا ہوا ہے اس سلسلے میں وہ ان بیچاروں سے خوب رقمیں بھی وصول کر لیتے تھے مسٹر بھیسے عجیب و غریب شخص تھے۔ یہ حضرت اپنے کو ہندوستانی بلکہ خالص مہاراشٹری ظاہر کرتے تھے۔ مگر درحقیقت وہ مہاراشٹری نہیں تھے۔ یہ کچھ زمانہ قبل جب میں جیل سے باہر تھا میرے پاس بھی اکثر تشریف لایا کرتے۔ راجپوتانہ کا زریڈ منٹ ان پر مہربان

تھا۔ اُس نے ان کو ایک سفارشی رقعہ لکھ کر دے دیا تھا۔ یہ اوس رقعہ کی کرامت تھی کہ آپ ملٹری میں کار خاص کے خدمات انجام دینے کے لئے انتخاب میں آگئے۔ ہم پر صحبت کے جو یہ پناہ ٹوٹے پڑے ہیں۔ اس میں ان کا بھی بہت کافی حصہ تھا۔ جس کا علم ہم کو بہت بعد کو ہوا۔

چاہ کن را چاہ ڈریں
 جو کتوان دوسرے کو گرانے کے لئے کھوتا ہے
 یا تا خروہ خود ہی اُس میں گرتا ہے
 یہی حال مسٹر بھینے کا ہوا۔ ان کا مذاق ستم رانی اور شوق یاد دہی اس درجہ ترقی پذیر ہو گیا کہ خواص تو خواص عوام ان کی حرکتوں سے تنگ آگئے۔ اور آخر کار سب نے منفقہ طور پر سیول عہدہ داروں کی خدمت میں ان کے خلاف احتجاج کیا۔ ان پر رشوت ستانی کا جرم بھی عاید کیا گیا۔ ماحوذ زونے پر چالان کیا گیا۔ اور محبٹریٹ نے ایک سال قید با مشقت کی سزا دی۔ گو ہندوستانی نوجی عہداروں نے ان کے بچاؤ کے لاکھ لاکھ جتن کئے مگر سب بیکار ثابت ہوئے۔ ہاں۔ محبٹریٹ نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی لکھا کہ یہ بہت خطرناک شخص ہے۔ اسے ایک سال سزائے با مشقت بھگتنے کے بعد شہر بدر کر دیا جائے۔

مسٹر بھینے نے جن لوگوں پر جھوٹے مقدمات چلا کر اور غلط الزامات لگا کر جیل میں بھجوا یا تھا۔ اب وہ خود بھی اذیتیں

لوگوں کے ساتھ تید و بند کے مصائب جھیلنے دکھائی دینے لگا۔

غور فرمائے کہ بھیسے کہ دل پر اس ماحول میں کیا گزری ہوگی
کس قدر روحانی نوبت کس درجہ نزات و انفعال بہ معاذ اللہ!
مسٹر بھیسے کے قید خانے میں آنے کے

فریضہ انسانیت کچھ دنوں بعد واپس ہمیشہ پھیل گئی اور

اس واپس نہ جانے کتنے انسان ضائع ہو گئے۔ مجھے جیل ڈیپارٹمنٹ

کی جانب سے کپیو نڈر اور وارڈن بنا دیا گیا تھا۔ میں مریضوں
کو دوائیں دیا کرتا اور ان کی ہر طرح طبی خدمت انجام دیتا
واؤں کا سارا اسٹاک ہر وقت میرے ہی قبضہ میں رہتا تھا۔

میں اگر طبیعت النفس ہوتا تو اس وقت مسٹر بھیسے سے میں اچھی

طرح انتقام لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ہمیشہ میں بری طرح مبتلا

ہو گئے تھے۔ اور ان کی دوا وغیرہ سب میرے ہی ہاتھ میں تھی

میں جو چاہتا ان کو پلا کر ان کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ مگر میرے ضمیر

میں اس قسم کا کوئی ناپاک تصور تک نہیں آیا بلکہ اس کے برخلاف

میں نے ان کو بہتر سے بہتر نایاب سے نایاب تر دوائیں دیں

جس سے خدا نے ان کو دوبارہ زندہ کی بخشی۔ گو اس وقت مریضوں

کی کثرت کی وجہ سے اچھی اور موثر دوائیں بہت ہی کم اسٹاک میں

رہنے پاتی تھی۔ بلکہ اکثر اوقات تو دوا ملتی تک نہ تھی۔ مگر میں نے اس

کے لئے علاج کی مشکل سے مشکل تدابیر کو بھی بخوشی اختیار کیا۔ کہ ان لوگوں

انسان سے انتقام لے کر اپنی فطرت کو بلند نہیں کر سکتا۔

حاجی وارڈ بوائے اسی زمانے میں ایک سوما لی قیدی سے بھی ملاقات ہوئی اس کا نام حاجی

تھا اور اس جیل کے دو اخلنے میں وارڈ بوائے بنا دیا گیا تھا۔

یہ شخص یوں تو دیکھنے میں بہت ہی سیدھا سادہانیک آدمی

معلوم ہوتا تھا لیکن اور سوما کی لوگوں کی طرح بہت ہی اشتعال

پزیر اور جلد غصہ میں آ جانے والا تھا۔ اس کے کسی دوسرے سوما لی

پر خنجر سے حملہ کیا تھا جس کا پانچ آٹھ ماہ کی سزا

تجویز ہوئی تھی۔ اس زمانہ ایری میں وہ مجھے بعض حیثیوں سے

بڑا ہی دلچسپ محسوس ہوا۔ میری اس کی دوستی ہو گئی جب فرصت

ملتی تو وہ اپنی زندگی کے حالات سنایا کرتا اور میری پہیلی

سنا کرتا۔ ایک روز اس نے دریافت کیا کہ تم محمد یوسف ہندوستانی

سے واقف ہو جو بمبائے میں علی وینا شرام میں ملازم بھی رہا ہے

میں نے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں واقف ہوں اور اچھی طرح

واقف ہوں۔ اب یہ سنتے ہی اس نے ایک لمبی چوڑی داستان سنائی

جس کا ماحض یہ تھا کہ میں نے اُسے قتل کر کے جہنم واصل کیا تھا میری

ہی خنجر نے اُسے اپنے شرمناک گناہوں کی سزا بھگتے کے لئے عالم آخرت

کو روانہ کیا ہے۔

محفل میلاد نبوی میں بے ادبی کی نینرا اس کا واقعہ قتل اس کے بعد اُس نے

اس طرح بیان کیا۔۔

ایک شب ہمارے یہاں۔ ہمارے پیغمبر صاحب کی میلاد مبارک کی محفل تھی۔ سب مسلمان جمع تھے۔ اور اس پاک بزم میں ادب و احترام کے ساتھ بیٹھے ہوئے دور و شریف پڑھ رہے تھے اتنے میں ملعون و مردود۔ اس طرح آیا کہ شراب سے بدست ہو رہا تھا۔ زبان سے اول نول بک رہا تھا۔ صرف اس قدر بکے جہاں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اوس سے قریب ہی پٹیاب بھی کیا او۔ اسے ذرا بھی حیا نہ آئی۔ شرکار محفل کو یہ بیہودگی سخت ناگوار لگ رہی اور انہوں نے اُسے بہلا بکاہا۔ مگر بجائے اس کے کہ اُسے کچھ شرم آتی اس نے اور زیادہ محمش گوئی شروع کر دی محفل میں بے حد بد مزگی پیدا ہوئی۔ اور یہ گالیاں بکتا ہوا روانہ ہوا اور میں بھی اس محفل مبارک میں شریک تھا۔ میں نے لاکھ چاہا مگر میں ضبط نہ کر سکا۔ مجھ پر استحال نے پوری طرح قابو پالیا۔ اور اُس عالم میں میں اُس کے پیچھے دوڑا۔ ایک تاریک اور خاموش کوچے میں میں نے اُسے پکڑا اور اپنا خنجر نکال کر میں نے اُس پر ایک حملہ کیا۔ میرا راہ اُسے قتل کرنے کا تو۔ بسا صرف مقصد یہ تھا کہ وہ زخمی ہو جائے۔ اور جب اس مدہوشی سے نجات ملے تو وہ یہ سمجھے کہ ایسی مفلس

محفل میں بیہودگی کی یہ سزا ہے۔ لیکن میرا حملہ انمازہ سے کچھ زیادہ
 کاری ہو گیا۔ وہ فوراً زمین پر گر گیا۔ میں اس کے بعد نہایت آہستگی
 کے ساتھ لوٹا اور خاموشی کے ساتھ پھر محفل میں بیٹھ گیا اور ذکر میلاد
 سننے لگا۔ یہ گستاخ اس حملہ سے جان برباد ہو سکا اور بالآخر
 سات آٹھ روزیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فی انار والسقر ہو گیا۔ پولیس نے
 محمد یوسف کے قاتل کی بہت تلاش کی۔ مگر اسے پتہ نہ چلا۔ اور بالآخر
 پولیس بھی تھک کر خاموش ہو گئی۔

یہ محمد یوسف وہی ہے۔ جس نے مجھے اس حد تک اذیت
 پہنچائی تھی۔ کہ میں پھانسی کے تختے پر لٹکتے لٹکتے بچ گیا تھا۔ حاجی
 کی زبانی میں نے یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا کہ قدرت بھی کتنی
 مستقیم ہے حاجی نے محمد یوسف کو قتل کیا۔ مگر مذہب و اخلاق
 کے نام پر یہ سزا بہت ہی سخت تھی اگر وہ اپنے مذہب کے علماء سے
 دریافت کرتا تو غالباً وہ بھی یہی کہتے کہ حاجی کی سزا وہی زیادتی
 سے خالی نہیں۔ مگر قضا و قدر ایسے ظالم اور دوسروں کی
 جان و آبرو کے بلا سبب دشمن کے لئے یہی فیصلہ کر چکی تھی بالآخر
 اس نے اس فیصلہ کے اجراء کے لئے حاجی کو آگ پھینکا۔

ادھر حاجی بھی ایک دوسرے سوہاگی پر حضور سے حملہ کرنے کے
 جرم میں ماخوذ ہوا اور جیل کے مصائب برداشت کرنے پر مجبور
 ٹھہرایا گیا۔ غرض قدرت کے نظام کو سمجھنا۔ انسانی عقل کی قوت

سے بہت ہی دور ہے اور پھر اس سے عجیب تر یہ واقعہ ہے۔ کہ حاجی جب جیل سے رہا ہو کر آزاد ہو گیا۔ تو کچھ روز کے بعد اس کی برادری ہی کے دو ایک شخصوں سے اس کی نزاع ہو گئی ایک دن موقعہ پا کر ان دونوں نے حاجی کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں شخص حاجی کو قتل کر کے کچھ آگے بڑھے ہی تھے۔ کہ ان کو کچھ اور لوگ ملے۔ ان لوگوں اور حاجی کے قاتلوں میں تکرار ... واقع ہوئی اور لوہنت یہاں تک پہنچی۔ کہ ان لوگوں نے ان قاتلوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ ان قاتلوں کے قاتلوں کا انجام رہا ہی ہوا کیونکہ انہوں نے اس امر کی قابل وثوق شہادت پیش کر دی تھی کہ ہم لوگوں نے اپنی جانیں بچانے کے لئے مجبوراً ان پر حملہ کیا اتنا تا یہ لوگ مر گئے مگر ہم ان پر حملہ نہ کرنے تو یقین تھا کہ یہ لوگ ہمارے قتل کر ڈالتے۔ عدالت نے ان کے بیان و شہادت کو اہمیت دی اور پچا کچھ کر ان کو رہا کر دیا۔

یہ واقعات ایک مال اندیش اور حقیقت نگر انسان کے لئے بہت عبرت آموز ہیں۔ آدمی ان واقعات سے بہت کچھ سوعظت اور سبق حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کے وقائع و حوادث میں دنیا والوں کے لئے طرح طرح کی ہدایات ہیں۔ مگر اللہ سے غفلت کہ انسان کو پھر بھی ہوش نہیں آتا۔

میں ابھی جیل ہی میں تھا یہ خبر ملی کہ نظام
 را مانند کا انجام را مانند بھی قدرتی انتقام کا اس طرح
 ہدف بنا۔ کہ وہ ایک روز گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ بے تھکاشا
 گرا اور بچ کر بواضطر اس کے عالم میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔
 خدا کے یہاں کچھ دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا
 کہ یہ وہی سنگمر ہے جس نے بے گناہ گنیش لعل کو بلا وجہ مبتلائے
 مصیبت کیا تھا۔

ہندوستانی فوج کا کارنامہ شجاعت

ہندوستانی فوج جو شمالی افریقہ میں جرمنی کے مقابلے
 کے لئے بلانی گئی تھی۔ اس کا تھوڑا سا ذکر بھی دیکھی سے خالی
 نہ ہوگا۔ یہ فوج جنرل ایکس کی سرکردگی میں تھی۔ جو پہلے چچ
 ہزار تجربہ کار مشاق اور بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ محکمہ اطلاعات
 جنگ نے اطلاع دی کہ ٹانگہ (ایک مشہور بندرگاہ) پر اس وقت
 جرمنی کی فوج بالکل نہیں ہے میدان بالکل خالی ہے۔ ایسی صورت
 میں بڑی فوج نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر سکتی ہے۔ اس
 میں کلام نہیں کہ یہ اطلاع غلط نہ تھی۔ اسی بنا پر ٹانگہ پر قبضہ
 کرنے کی غرض سے یہ ہندوستانی جمیعت روانہ ہوئی۔ جرمن گورنر

نے جب ہندوستانی فوج کے آنے کی خبر سنی تو اپنے پاس سامان
دفاع نہ پا کر لفٹنٹ وان ٹیڈر جرمن فوجی افسر، کو حکم دیا کہ
اب میان مقاومت دشوار ہے اس لئے پیچھے ہٹ جاؤ لفٹنٹ
موصوف۔ بہت ہی موقعہ شناس ذہن اور دلیر شخص تھا۔ اُس
نے اپنے گورنر کا حکم نہیں مانا۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ یہ ہندوستانی
فوج وہ ہے جسے ان کی مرضی کے خلاف، انگریزی حکومت اپنے
مفاد کی خاطر تیار ہی ہے اور چونکہ ان کو پیٹ کی مار سے دسے کر
اور ہر طرح مجبور کر کے ہمارے مقابلے کئے لایا گیا ہے اس لئے
ان میں کچی بہادری کا جوہر نہیں ہو سکتا۔

جرمن لفٹنٹ نے ادھر ادھر سے ٹھوڑی سی جمعیت فراہم کی
جو کس طرح چند سو سے زیادہ نہ تھے، اور بالآخر اس ہندوستانی
کثیر التعداد فوج پر نہایت بے جگری سے ٹوٹ پڑا۔

۱۶۔ (سولہ سو) ہندوستانی فوجیوں کو بری طرح مجروح کیا اور
نہ جانے کتنوں کو عدم کی راہ روانہ کیا۔ انگریز کمانڈنگ آفیسر
یہ سمجھا کہ جرمنی کی فوج بہت زیادہ ہے اور جو اطلاع دی گئی تھی وہ
غلط ہے اس خیال نے اس کی ہمت چھین لی۔ اور اس یقین
نے مضبوطی حاصل کر لی کہ اب ہم ذرا اور ٹھہرے تو بقیہ فوج کی بھی
جان نہیں بچ سکتی۔ اسی خوف کے ساتھ وہ پوری فوج لے کر بے شک
پیچھے کی طرف بھاگا۔ اور بقیہ فوج کو کسی نہ کسی طرح جہاز میں سوار

۱۸۳
 کر کے بمباسہ میں لا اتارا اور یہاں پہونچکر غائب شدہ ہوش
 و حواس درست ہوئے۔

شمالی افریقہ میں جرمن فتوحات

اس واقعہ نے جب قدر ہندوستانی فوج کے عزم و قوت
 کو کمزور کر دیا اسی قدر جرمنوں کے حوصلے بڑھتے گئے۔ اور برابر ایک
 سال تک جرمن اس علاقے میں فاتح و مظفر ہونے لگے۔ اور
 ان کا روز بروز افزاد ہوتا گیا۔ اس سے انگریزی جنگی پالیسی
 پر بہت برا اثر پڑا۔ جنرل آگلس کو تعزیراً واپس بلا یا گیا۔ اور
 ہندوستانی سپاہیوں اور بڑے عہدے داروں کو ذلت
 کے ساتھ نکال دیا گیا۔

بیل میں میری نگاہوں سے
 قید میں میرا ایک دلچسپ مشغلہ۔ ۹ عجیب عجیب واقعات
 گذرتے تھے۔ طرح طرح کے قیدیوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ ہاں
 مجرم اور جرم ناکرہ وہ عرض دونوں قسم کے لوگ دیکھنے میں آتے
 تھے۔ ادنیٰ میں سے کتنے ہی واجب الرحم تھے۔ جنہوں نے کوئی
 جرم ہی نہیں کیا تھا۔ اور گردش قسمت سے اس آزمائش میں
 میں مبتلا ہو گئے تھے۔ گو میں بھی ایک قیدی ہی تھا اور دوسرے

مجبوراً سیرول میں اور مجھ میں کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ تاہم میرا دل انسانیت کی اس مجردیت پر بہت دکھتا تھا۔ میں برابر اس فکر میں رہتا کہ جو مستحق سزا نہیں ہے انہیں سزا سے نجات ملنی چاہئے۔ اور واقعی مجرم کو اس کے کیفر کردار تک پہنچنا عین قرین عدالت ہے۔

میں اس خیال کے تحت اس عالم مجبوری میں جو کچھ بھی کر سکتا تھا اس سے غفلت نہیں برتنا تھا۔ اکثر میری کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور کتنے ہی قیدی ایسے بھی تھے۔ جو بے قصور تھے۔ اور میری حقیر کوششیں ان کی سزا معاف کرنے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔ میری مساعی کی یہ کامیابیاں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہیں۔ اس سے قبل وہاں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

جیل کے عہدہ داروں کی زیادتیاں اور ان کے خاموش مظالم کا مقابلہ کرنا بھی میرے لئے بعض وقت ناگزیر ہو جاتا تھا اس میں کبھی ان کے مذاق کو اور کبھی میرے ضبط کو فتح حاصل ہوتی رہتی تھی۔

کبھی مسلمانوں کا مقدمہ قتل اسی زمانہ قید میں ایک مرتبہ ایک کبھی کے قتل کے الزام میں نذ کبھی گرفتار کر کے لائے گئے۔ یہ لوگ بھڑاتے قوم کے تھے اور ان کا ہمیشہ جہاز رانی تھا عرصہ دراز سے ان لوگوں کا قیام ممبایہ میں

تھا۔ یہ لوگ سخت جاہل اور انتہا درجہ کے لڑاکو ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک شب بمبارہ کے بازار میں یہ لوگ آپس میں حسب معمول لڑ پڑے ان میں سے ایک نے دوسرے کو خنجر بھونکدیا اور وہ فوراً مر گیا۔

مقتول کی پارٹی نے پولیس کی رپورٹ میں اس ایک شخص کے ساتھ جو واقعی مجرم تھا آٹھ اور بے گناہوں کے نام بھی نوٹ کرائے۔ پولیس نے نوآدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ عدالت میں کئی ماہ چلتا رہا۔ ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ بھائیوں سنو۔ واقعہ قتل سے کسی عنوان انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ قتل ہوا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تمہیں نوآدمیوں میں سے کسی ایک نے اُسے قتل کیا ہے۔ ایک شخص کی وجہ سے سب لوگ نوکیوں بتلائے آفت ہوں بہتر ہے کہ جس کسی ایک نے قتل کیا ہے وہ عدالت میں صاف صاف اقرار کرے ایسی صورت میں صرف ایک ہی شخص متوجیب نہڑاٹھیرے گا۔ باقی اور آٹھ بے گناہ اشخاص کی جان تونج جائے گی۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک کی وجہ سے لو انسان تباہ برباد ہوں؟ لیکن میرے مشورہ پر کس نے عمل نہیں کیا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حکومت ایک قتل کے سلسلے میں نوآدمیوں کو تختہ دار پر نہیں لٹکائیگی۔ کچھ دنوں کی نرائے قید ہو جائے گی۔ اور آخر میں سب کے سب زندہ و

دوسلاست بچ جائیں گے مگر ان کا یہ خیال بالکل نقش بر آب ثابت ہوا۔ اور عدالت نے اپنے فیصلہ میں ان میں سے پانچ آدمیوں کو پھانسی کی سزا دی۔ اور چار کو رہا کر دیا۔ یہ لوگ پریو کونسل تکسٹرے مگر عدالت تخت ہی کا فیصلہ سجال رہا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص کی وجہ سے بلا وجہ اتنے انسانوں کی جان گئی۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مجرم پھانسی کا عبرتناک نظارہ کو پھانسی دینا ہوتا ہے تو ۲۴ گھنٹے قبل اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ فلان وقت تم کو حکم سرکار پھانسی دی جائے گی۔ چنانچہ اس قاعدے کے مطابق ان پانچوں اشخاص کو بھی اطلاع دی گئی۔ یہاں علم النض کی روشنی میں یہ واقعیت مشاہدہ میں آئی کہ ان میں جو شخص واقعی مجرم اور حقیقی قاتل تھا وہی جرموت سن کر سب سے زیادہ دہشت زدہ ہوا۔ وہی سب سے زیادہ پست ہمت نظر آیا۔ رونا دہونا جنج و فرع غرض بزدلی اور بے ہمتی کی جتنی علامات ہو سکتی ہیں وہ سب اس میں دفعہ نمایاں ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دماغ معطل ہو گیا ہے اور اس کے جسم کا تمام خون خشک ہو گیا ہے۔ اور اس کے تمام اعضا کی قوت سلب ہو گئی ہے برخلاف اس کے دوسرے چار آدمی نہایت مطمئن۔ ہشاش و بشاش، بلکہ تبسم

اور خندان نظر آتے تھے اُن کے تختہ دار پر بھی جانے سے چند منٹ پہلے۔ میں ان کے کمروں کی جانب سے گزرا تو ان چاروں بے گناہوں نے میری جانب ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اُن کے چہرے بے قصوری کے نور سے چمک رہے تھے اور ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ تھی انہوں نے مجھے دیکھا تو بہت ہی پر جوش انداز میں آخری سلام کیا۔ اور پانچواں شخص جو واقعی مجرم تھا۔ اُس کے چہرے پر جرم کی سیاہی پھیلی ہوئی، اور لبوں پر ظلم کی عفو نیت بکھری نظر آ رہی تھی وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑا اس طرح تڑپ رہا تھا جیسے کسی نے اُسے نوح کر دیا ہو۔ اس عبرت آفرین نظارے نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ اور مجھے ماننا پڑا کہ بے گناہ ہی ایک مستقل طاقت، ایک پائدار ^{نیت} قوت ہے۔ اور جرم ایک مستقل کمزوری اور ایک پائدار کشتافت ہے بے قصور کی موت و حیات دونوں مطمئن اور مجرم کی زندگی و موت دونوں دولت سکون سے محروم ہوتی ہیں۔

غرض جیل کی زندگی جیسا بے خود ایک مستقل زندگی ہے جس میں مواعظت و بصیرت حاصل کرنے کے اتنے اہم مقامات و منازل ہوتے ہیں۔ کہ شاید جیل کے باہر ممکن نہیں۔ میری قید و بند کی تمام مدت، مدتِ تعلیم و تحصیل ہے۔ مجھے جیل کی تاریکی حقیقت و واقعیت کی بے شمار روشیناں نظر آئیں جو اس سے پہلے کہیں

لنظر آتی تھیں۔ قید ہو اور وہ بھی بگینا ہی کی قید جو صرف قوت کی لٹنگی ستم رانی کے بھانے کی خاطر جھیلی جا رہی ہو تو پھر زندگی اتنی بے لوث اتنی خالص اتنی پاکیزہ و بلند ہو جاتی ہے کہ اس کا تصور بھی آسانی سے نہیں کیا جاسکتا مقام شکر ہے کہ میری قید کی یہی حیثیت تھی گو میرا جسم پابند، اور گرفتار تھا۔ مگر دماغ اور میری روح یکسر آزاد تھا۔ یہ قید۔ یہ ایسری بھی کتنی مبارک تھی جس نے حقائق حیات کے تفضل دروازے مجھ پر کھلا دیے۔

قید بے قیدی پر ایک طائرانہ نگاہ
 جیسا کہ پہلے عرض کر چکا
 ہوں کہ مجھے یکم اگست ۱۹۱۵ء میں گرفتار کیا گیا۔ اور ۱۹۱۶ء کی زندانِ بلا کی بندشوں میں جکڑا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں جب دفتری حکومت کے پرزوں کو یہ محسوس ہوا کہ میرا وجود قصرِ حکومت کے بلند مرتبہ اراکین کے علاوہ خود جیل کے اسٹاف کے لئے بھی مستقل مصیبت ہے کیونکہ میں نے حتی الامکان ان کے ذوقِ حفاگری اور مظلوموں کے درمیان روک کی دیوار بن جانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اس کوشش میں اکثر کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ ایک قیدی کی یہ کامرانی ان حکومت کے غلاموں کو کب برداشت ہو سکتی تھی، مجبوراً انہوں نے میرا تبادلہ بیاس سے بیرونی جیل میں کر دیا۔ اس جیل میں میرے ذمے خیاطی کا کام کیا گیا۔ جو ظاہر ہے کہ میرے مذاق کے مناسب نہ تھا۔ تیرہ

میں تہنا تھا اور میرے پانچ رفقاءے مجس بمباسہ ہی میں تھے۔
 جگ غظیم کے اختتام کے
 بعد ہی ہندوستانی لیڈروں
 سے گفتگو اور اسکے نتائج
 نے گورنروں سے ملاقات
 کر کے یہ درخواست کی کہ ہم لوگوں کو جو دراصل بالکل بے حضور
 ہیں اگر دوران جنگ میں قابل رہائی نہیں تھے تو اب تو کوئی ٹاہس
 وجہ نہیں جو رہائی کے مستحق نہ سمجھے جائیں۔ بہرگواس قید و بند سے
 آزادی ملنی چاہئے۔

گورنر نے ہندوستانی لیڈروں کی گفتگو نہایت غور و تامل کے
 ساتھ سنی۔ اور جواب میں کہا کہ اگر یہ چند افراد اس امر کا تحریری
 اقرار کریں کہ رہا ہونے کے بعد کسی ایسی تحریک میں حصہ نہ لیں گے
 جو حکومت کے خلاف ہو تو ان کو رہا کر دیا جائکتا ہے ورنہ عدل حکمی
 کی صورت میں ان کو ملک ہی سے باہر کر دیا جائے گا۔

بمباسہ میں جو پانچ افراد تھے جب ان کے سامنے رہائی
 کی یہ شرط رکھی گئی تو انہوں نے اسے منظور کر لیا اور انہوں نے اپنے
 مصلح کے تحت اس قسم کی شرط کو مان لینا نامناسب نہ سمجھا۔ مگر
 میرے لئے جو اس وقت یروپی کی جیل میں تہنا تھا۔ یہ عقدہ اتنا
 آسان نہ تھا۔ جتنا میرے دوسرے پانچ ساتھیوں نے سمجھا۔ میر
 ضمیر نے حکومت سے اس قسم کا سودا کرنا مطلقاً پسند نہیں کیا۔

کیونکہ عدل و انصاف کی ضمانت مظلوموں سے ہمدردی لانے
 جائز حقوق کا مطالبہ کرنا اور اس قسم کے دوسرے کام جو انسانیت
 کی خدمت کے سلسلے میں آتے ہیں اکثر مزاج حکومت پر گران گزرتے
 ہیں۔ اور زبان حکومت ان کو بغاوت اور نافرمانی سے تعبیر کر کے
 خود ہی مدعی بنا کرتی ہے۔ اور خود ہی جج بن کر اپنے فریق کے حق
 میں ظلم و جور میں ڈوبا ہوا فیصلہ کرتی ہے۔ حکومتوں کا یہ قدیم
 دستور ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ آخر میں نے اس مرتبہ سرکار کی
 کونسی مخالفت کی تھی۔ جس کی یہ سزا دی گئی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ
 کالوں کو بھی گوردوں کے برابر ہی انسان سمجھا جائے گوردوں کے
 مقابلے میں کالوں کو ذلیل و حقیر نہ سمجھا جائے۔ اور گورے رنگ
 میں فرق کے معنی یہ نہیں کہ کالے جسم و جان۔ عزت نہیں کھتے
 لیکن میرا یہ جائز مطالبہ جو انسانیت کی حمایت میں تھا۔ بغاوت
 سے تعبیر کیا گیا۔ جب حکومت کی خوش منہی کا یہ عالم ہے تو ظاہر
 ہے کہ اس سے کوئی معافیت کیسے کی جاسکتی ہے۔ وہ ہماری
 ہڈیاں کو سراسر نافرمانی اور ہمارے ہر آنسو کو سیل بغاوت
 سے موسوم کر کے ہمارے ساتھ جب چاہے بدسلوکی کر سکتی
 ہے۔ چونکہ گوردوں کے الفاظ کے اندر چھپی ہوئی روح کو محسوس
 کرنے میں ذرا بھی وقت نہیں محسوس کی۔ میں نے صاف جواب
 دے دیا:۔

میں مشروط رہائی کے مقابلے میں عمر بہر کے لئے
 ملک سے باہر ہو جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں حکومت
 سے اپنی رہائی کے لئے کوئی معاملت کرنا اپنے لئے
 جائز نہیں سمجھتا۔ میں نے حکومت کے خلاف پہلے ہی
 کوئی بغاوت کا علم بلند نہیں کیا تھا جس کی بنا پر مجھے
 جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ کالوں
 کو بھی گوروں ہی طرح آدمی سمجھا جائے، ہر کو بھی وہی
 حقوق دیئے جائیں جو اپنے ملک کے لوگوں کو دے
 رکھے ہیں۔ یہ ایک جائز مطالبہ تھا جو ہر طرح جائز
 ہر طرح ضروری، اور عدل کے دائرے میں تھا۔ مگر
 میرا یہ مطالبہ بغاوت سمجھا گیا۔ مگر چار سال تک ظلم
 و ستم سہنے کے بعد بھی میرا یہ خیال موٹا نہ ہو سکا وہی سوج
 آج بھی زندہ ہے وہی خیالات اس وقت بھی
 دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔

اس لئے اگر میں جیل سے آج رہائی پا جاؤں
 تو میرا سب سے پہلا مطالبہ حکومت سے وہی ہو گا
 جو آج سے چار سال قبل تھا اور جس کی بنا پر مجھے یہ
 طویل قید کاٹنی پڑی۔ اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہی
 اس ملک ہی کو چھوڑ دوں مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ مظلوم

انسانیت کی حمایت میں کوئی آواز نہ بلند کروں۔
اگر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا ہی بغاوت ہے
تو میں بغاوت پر مجبور ہوں۔

میرے پانچ رفقاء جو بمبارہ میں تھے انہوں نے حکومت سے شرط
رہائی حاصل کرنی تھی۔ اب میرا مسئلہ خاص تھا اسٹرائٹس میں لال و بیانی صاحب
(انڈین ایسوسی ایشن کے مقصد) کی پیرا سے ہوئی کہ میں ایسوسی ایشن کو
ایک خط اس مضمون کا کہوں کہ ایسوسی ایشن کا نمائندہ گورنر سے
ملکر بلا قید و شرط میری رہائی کے بارے میں گفتگو کرے، ابھی ایسی
ایشن کا نمائندہ گورنر کے پاس پہنچا بھی نہیں تھا کہ مجھے جیل میں یہ
حکم ملا کہ میں ملک کے باہر جلد از جلد چلا جاؤں اور اس نادری
حکم کے ساتھ پاسپورٹ بھی تھا۔ میں جیل میں اس حکم پانے کے بعد
منتظر تھا کہ کب سرکاری فرشتے مجھے جیل سے نکال کر جہاز پر سوار کرتے
ہیں۔ اسی اثنا میں ایسوسی ایشن کے نمائندے نے گورنر سے ملاقات
کرنی اور تقریباً حسب مرام فیصلہ ہو گیا۔

قی
رہائی کو ابھی دو چار دن باقی

ایک بیرسٹر صاحب کا خبط نصیحت ہی تھے کہ دیانی صاحب

مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے اُن کے ساتھ ایک بیرسٹر صاحب
بھی تھے جو ہمارے رٹ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مجھے پند و نصیحت
کرنی شروع کی۔ کہ رہائی کے بعد مجھے کس طرح حکومت سے ڈر کر بائبل

اُس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے اور مجھے کیونکر سیاسی خدمات سے کنارہ کش ہو کر پر امن زندگی و عافیت فضا میں بقیہ صرف کرنی چاہئے۔ مجھے بیرسٹر صاحب کی یہ علامانہ لقبیت سخت ناگوار گزری۔ کہ یہ حضرت مجھے کس طرف لے جانا چاہتے ہیں؟

میں نے دیپائی صاحب سے دریافت کیا کہ بیرسٹر صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں کیا میں اس سے ایوسی ایشن کی جانب سے باور کروں یا یہ بیرسٹر صاحب کی ذاتی و شخصی تعلیم سے دیپائی صاحب نے فرمایا کہ اس گفتگو کا ایوسی ایشن سے کوئی تعلق نہیں بیرسٹر صاحب نے اپنی جانب سے فرمایا ہے۔ دیپائی صاحب نے یہ بھی کہا کہ تمہاری رہائی کے بعد حکومت یا ایوسی ایشن کی جانب سے تمہارے کردار پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ اور تم اپنے خیال و عمل میں صاحب اختیار ہو گے، اس کے بعد تو میں نے بیرسٹر صاحب کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ۔

بیرسٹر صاحب! میں نے آپ سے کہیں زیادہ مدت اس ملک میں گزار دی ہے یہاں کے جزئیات و کلیات کا جتنا علم مجھ کو ہے۔ آپ کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے براہ کرم یہ یقینت آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔ اور دوبارہ اس قسم کی کوئی رحمت کبھی نہ فرمائیں۔ کیونکہ میرا اعتماد ہندوستان کے سب سے بڑے فلسفی اور شاعر کی زبان میں اس شعر پر ہے:-

بدریا غلط و یا حوشن در آویز جیات جاودان اندر تینراست
 بیشر صاحب اپنا منہ لیکر آپہ گئے اور پھر ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا
 رہائی پانے کے بعد میرے لئے
 پھر وہی میدان اور وہی دور دنیا ہی نئی تھی۔ میری اس
 طویل مدت قید نے میرا تمام کاروبار ختم کر دیا۔ اور حصول رزق کے
 جو دروازے میری جدوجہد نے کھولے تھے۔ وہ سب یکسر بند ہو
 چکے تھے۔ میرے سامنے معاش کا سوال پھرنے انداز میں آیا۔
 کیونکہ میرے ہاتھ میں ایسی پونجی نہیں تھی جس سے میں کوئی دھندا
 شروع کروں۔ اور نہ میرا ضمیر اسے پسند کرتا تھا کہ میں ٹھکم پروری
 کے لئے دوست و احباب کا کسی عنوان احسان لوں۔ غور و فکر
 کے بعد ایک راہ سمجھ میں آئی وہ یہ کہ میں سردست نیلام (کشنری)
 کام شروع کروں کیونکہ اس کام میں زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہیں
 پڑتی۔ چنانچہ میں نیروبی میں چند ماہ رکھ کر مباسہ آیا۔ اور یہاں
 اجازت لے کر ککشنری شروع کر دی۔ یہ کام بھی منفعیت بخش
 ثابت ہوا۔ اور پہلے ہی سال کافی فائدہ حاصل ہوا۔ میں گرفتار
 ہوتے ہی اپنی رفیقہ حیات کو ہندوستان روانہ کر دیا تھا۔ مگر
 بعد از رہائی میں نے اُن کو اپنے پاس بمباسہ بلا لیا اور وہ حسب
 سابق میرے دکھ درد اور میرے کاروبار میں شریک ہو گئیں۔

۱۹۵

۱۹۱۴ء میں کانگریس کا پہلا اجلاس
 کانگریس میں از سر نو شرکت منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس
 کی پاداش میں ہندوستانی مقیم افریقہ، پر شدید مظالم کئے گئے تھے
 حکومت کی جانب سے اس قدر زیادتیاں کی گئیں تھیں کہ پھر
 ان میں اپنی مظلومی کے خلاف آواز بلند کر نیکا حوصلہ ہی باقی
 نہیں رہا تھا۔ پھر دوسرے سال کانگریس کا انعقاد ان بے دست
 و پا مجبور ہندوستانیوں کی بس کی بات نہیں تھی۔ ۱۹۱۵ء
 میں مارشل لانا فذ کیا گیا۔ حکومت کی اس شدت اور تو اتر نے بھی
 ہندوستانیوں کو بالکل بے جان کر دیا۔ بہاسہ میں سیاسی تحریک
 کا تقریباً دم نکل ہی چکا تھا لیکن نیروبی میں سنی اصل دیسائی کی
 جدوجہد سے کچھ سیاسی سرگرمی ابھی زندہ تھی گو ۱۹۱۹ء میں مارشل لا
 منسوخ ہو گیا تھا لیکن پہلے کی سمائی ہوئی دہشت جو ہندوستانیوں
 کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ کس طرح کم ہوتی نظر نہ آتی تھی؟
 خوف و ہراس کی شدت نے جو غفلت پیدا کر دیا تھا۔ اس کو مٹانے
 کے لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بہاسہ میں اس تحریک
 کو زندہ کرنے کے لئے جتنی کوششیں کیں سب بیکار گئیں۔ اس لئے
 انہوں نے باصرار مجھے اس تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے اٹھا
 چاہا اور انہوں نے کہا کہ تم اس کام کے لئے نہیں کھڑے ہو گے تو نہ
 صرف یہ کہ ہمیشہ کے لئے سیاسی سرگرمیوں کا دروازہ بند ہو جائیگا

بلکہ اس راہ میں اب تک جتنی قربانیاں کی جا چکی ہیں سب ضائع ہو جائیگی۔

اس وقت میرے دل کے اضطراب کا عالم نہ پوچھئے دل کا تقاضا یہ تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے اس مبارک تحریک میں پوری دہی یعنی چاہئے اور جس طرح بھی ہو تحریک کا نگرہ میں حصہ لیں۔ اور ایک نئی مگر مضبوط زندگی پیدا کرنی چاہئے۔

لیکن عقل کی مصلحت اندیشی کہتی تھی کہ اگر سیاسی تحریک کے دائرے میں پھر قدم رکھا تو حکومت پھر تمکو دعوت داد و سن یا تم از کم ضیافت زندان سے ضرور نوازیگی۔ اور اگر حکومت نے قانون کے تحت کچھ نہ بھی کیا تو کم از کم تمہارا موجودہ کاروبار یعنی اکثریتی کا دہندہ باہل ختم ہو جائیگا۔ تم کو اپنا مخالف دیکھ کر تم سے ملت قطعی ترک کر دیں گے۔ اور تم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائیگا میں اس کشمکش میں تھا کہ بہکوت گتیا کی روشنی نے مجھے راستہ دکھایا۔ اور میری رفیقہ جیات نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اپنی ذاتی منفعت اور سلامتی پر اس تحریک میں شرکت کو ترجیح دوں۔ جس کی کامیابی پر دوسرے تمام بھائیوں کی فلاح و بہبود کا اٹھا بھی ہے۔

مختصر یہ کہ دیپائی صاحب نیروپی سے بیباک شریف لائے اور انہوں نے کانگریس میں میری شرکت پر مبارک باد دی

اور آئندہ میقات پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک جلسہ کرنا چاہا اور اس کے لئے اعلان عام ہوتے ہی بعض اجاب آئے۔ اور یہ مشورہ دے گئے کہ خبردار تم اس جلسہ میں شرکت نہ کرنا ورنہ حکومت تم پر کوئی نہ کوئی الزام عائد کر کے پھر جیل میں بند کر دیگی۔

ادھر دوستوں کا یہ مشورہ تھا کہ اُس طرف دیسانی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا اگر تم نے اس تحریک میں عملی سرگرمی سے کام نہ لیا تو بیاسی تحریک کی ناکامی کے تنہا تم مجرم ہو گے کیونکہ قدرت سے تم کو یہ قوت ملے ہے کہ تم ان اٹھ بیسوں کو پھیرا جھٹکتے ہو اور تمہارا دلالتہ ہاتھ سمیٹے رکھتا تم کو بے جرم نہیں قرار دے سکتا۔ یہ میرے بعض دوستوں اور دیسانی صاحب کی اپنی اپنی رائے تھی۔ اور جس رائے پر مجھے چلنا تھا وہ خود میرے دل کی تھی، جو مجھ کو پہلے بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہ اتفاق تھا کہ دیسانی صاحب کا ارشاد اور میرے ضمیر کی پکار باہم متحد نکلی۔

مختصر یہ کہ جلسہ ہوا اور بہت ہی پر زور اور شاندار ہوا میں نے لوگوں کو اس تحریک میں شرکت اور عملی سرگرمی کی موثر پرائے میں بالا اعلان دعوت دی۔ میرے معروضات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہاں تک کہ جو مخالف تھے وہ بھی موافق ہو گئے۔ کانگریس از سر نو قدام کی گئی اور پبلک نے شدید اصرار سے مجھ ہی کو اس کا عقد قرار دیا۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس پورے لمطراق کے ساتھ پھر اسی مباسہ میں ہوا۔ کثیر مجمع۔ شاندار پنڈال۔ گرما گرم تقریریں۔ زندگی بھٹن تجویزیں، وطنی و قومی نرانے غرض پورے جوش و حرش کا اظہار ہوا۔

جس طرح پہلی کانگریس کا آماز میری رفیقہ حیات نے ”بند ماترم“ کے ترانے سے کیا تھا اسی طرح اس کانگریس کا افتتاح بھی انہوں نے اپنے ترانے سے کیا تھا۔ آج میری رفیقہ حیات مسرور اور بید خوش بھٹیں۔ کیونکہ ایک عظیم الشان کانگریس کے افتتاح کی عزت و سعادت اُن کو دوبارہ حاصل ہوئی۔

کوسٹ عرب ایسوسی ایشن

اسی کانگریس کے پنڈال میں عرب بھائیوں کے حقوق کی حفاظت اور سلب کردہ حقوق کی واپسی کی جدوجہد اُن کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ”دی کوسٹ عرب ایسوسی ایشن“ نام سے ایک انجمن کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔

عرب قوم جس بلندی پر تھی آج اتنی ہی پستی میں ہے اسی افریقہ میں کبھی اُن کی وہ شاندار حکومت تھی جسے یورپ کے مدبرین بھی آہنی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ انقلابات زمانے کے خوبی طوفان کی رومیں اضوں آج عرب بھی زبون حالت میں

ہیں اگر ان کی صحیح رہنمائی کی جائے تو میرا خیال ہے کہ ان کے وہ تمام نقوش جاہ و جلال ابھی ابھر سکتے ہیں۔ جن کو زمانے کی سیدہ دل نے محو کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا انجمن اس مقدس اور اہم خدمت کی پہلی حقیر کوشش تھی۔ جو حقیر سے ظاہر ہوئی۔ اور جس کا اعتراف وہاں کے جملہ سربراہان اور وہ لوگوں کو آج تک ہے چنانچہ اس کتاب کا خاتمہ انہیں کے وداعی سپانامہ پر کیا جائے گا۔ جو انہوں نے ہندوستان آنے وقت وداعی جلسہ میں اپنی محبت و اخلاص سے پیش کیا تھا۔

ہندوستانیوں کی سماجی حالت پر
سوشل سروس لیگ نے اور ان میں معاشی ترقی پیدا کرنے کی غرض سے پوری سرکردگی میں سوشل سروس لیگ قائم کی گئی۔
 مٹر کیسری سنگھ سوڈھا اور مٹر دو سال مہتا اور دوسرے بعض نوجوانوں نے اس لیگ کے سلسلے میں میرا بہت سا تقہ دیا۔
 اور یہ لیگ وہاں کے ہندوستانیوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی
 سنتا ہوں کہ یہ لیگ آج تک زندہ ہے اور کام کر رہی ہے
 سچی اور مخلص میری دعائیں اُس کے ساتھ ہیں
 مذکورہ بالا بیاسہ کانگریس کے ایک سال بعد تیسری کانگریس
 نیروبی میں منعقد ہوئی خوشی کا مقام ہے کہ نیروبی کانگریس آج تک
 سرگرم کار ہے۔

ہندوستان کو واپسی

جولائی ۱۹۲۱ء میں افریقہ سے بغرض تبدیل آب و

ہوا صرف چار چھ ماہ قیام کی غرض سے میں ہندوستان آیا۔
 مگر اس مرتبہ میرے لئے اس کی خاک میں ایسی زبردست کشش
 محسوس ہوئی کہ باوجود کوشش کے میں افریقہ واپس نہ جاسکا
 اور آج تک یہیں نزلے جیات بھگت رہا ہوں۔

یہ کتاب یعنی، میرے دردِ دل کی داستان نامکمل رہیگی اگر میں اپنے اُن مسلمان اجاب اور مخلصین کی یاد سے پھر ایک بار اکتابِ نوروِ ظلمت نکل لوں جنوں نے اپنے انٹ نفوشِ اِخلاص میری سو بچ نکل و نظر بہ ثبت کر دیئے ہیں اس سلسلے میں بے محل نہ ہوگا اگر میں انہیں کے الفاظ و حکمت کا اعادہ کروں جو انہوں نے میرے افریقہ چھوڑتے اور ہندوستان آتے وقت بعنوانِ دعاغی سپاسنامہ میرے ساتھ کر دیے

تھے۔
گوشے ۹ افریقہ کے ان مسلمان بھائیوں کی

مضطرب و بے قرار یاد سے محشرستان بنے ہوئے ہیں آج بھی اُن کا تصور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا حراج و وصول کر رہا ہے۔ آج بھی میری روح، اُن کی قربت کے لئے تڑپ رہی ہے۔

مگر آہ وہ کہاں - اور میں کہاں — ؟

وداعی پیاسنا

بشرف ملاحظہ عالیجناب مسٹریکٹمن ہما دیوسا لے دام فیوہم

جناب والا!

ہم تمام عرب قوم کی جانب سے آپ کی اس روانگی کے موقع پر دل کے عمیق ترین گوشوں میں حسرت و غم کے پرورش یافتہ جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور قلب و روح کی پوری صداقت میں ڈوبے ہوئے اور خلوص و محبت کی عطر میں بسے ہوئے خدا کا کلمہ کہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

ہم اس اہم مشرقی افریقی، نیشنل کانگریس (تایم شدہ ۱۹۴۷ء) اور انڈین ایسوسی ایشن دارالسلام سے بخوبی آشنا ہیں جن کی جناب والہ نے بنیادیں ڈال کر اور ان کو زندگی اور فلاح کے میدان میں سرگرم عمل کر کے افراد ملک و قوم کی اہم خدمات انجام دین اس کے ساتھ ہی

ساتھ ہم آپ کے اس عظیم احسان کو بھی فراموش نہیں کر سکتے جو آپ نے
۲۳ جوں کو عرب ایسوسی ایشن کے قیام کی صورت میں ہم پر کیا۔ اور
اس طرح آپ نے ہمارے بھرے ہوئے شیرازہ کو ایک مضبوط لٹری
میں پرودیا آپ نے بلا لحاظ قوم و مذہب جس طرح مظلوموں کی
حمایت اور اس راہ میں جیسی جیسی بے مثال قربانیاں کیں۔ وہ سب
ہمارے سامنے ہیں اور ہمارے حق میں مشعل راہ بنی ہوئی ہیں
قوم کو اس کا اعتراف ہے کہ آپ نے کن کن خطرات اور نازک مواقع
پر ہر قسم کے مالی و جانی نقصانات برداشت کر کے قوم کا ساتھ دیا
اور کس غلوص و دیانت سے ہر موقع پر ان کی صحیح رہنمائی فرمائی۔

جناب منظم! آج سے دو سال قبل اس ملک میں بغرض تجارت
تشریف لائے مگر آپ نے اپنے مقصد کو اپنے اہلکے جنس اور عرفیم
کے مقاصد نجات پر فیاضانہ قربان کر دیا۔ جس کے لئے ہم آپ کے صمیم
قلب سے شکر گزار اور ممنون ہیں۔

آپ نے ہم سب کو ایک سیدھی راہ پر لگا دیا ہے جس پر
اگر ہم آپ کی ہدایات کے مطابق گامزن رہیں تو وہ دن دور
ہیں جب ہماری منزل مقصود خود ہمارے پاؤں چوسکی۔

ہمارے محبوب قائد آپ کے تشریف لے جانے سے ایسوسی
ایشن کانگریس اور دوسری انجمنیں ایک ایسی کمی محسوس کر رہی ہیں کسی طرح
پوری نہیں ہو سکتی۔ ان قومی و ملکی اداروں کے کام کرنے والے

ہر وقت اور ہر حال میں آپ کی بیش بہا ہدایات کے محتاج رہیں گے۔
 آپ کے یہ شاندار روایت رہبری اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں
 آپ جب اور جس قوم کی رہنمائی کریں گے وہ قوم بہت جلد اپنی مطلوب
 و مقصود لیلا ترقی، اور سلطے فلاح و بہبود سے ہم آغوش ہو کر رہیگی
 ہم ہیں کو سٹ عرب ایسوسی ایشن کے ترجمان

(۱) رشید بن سعود صدر

(۲) سلیمان بن رشید نائب صدر

(۳) مسلم بن قاسم خاندان

(۴) حیدر محمد - معتمد

مورخہ ۹ جولائی ۱۹۲۱ء

